جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
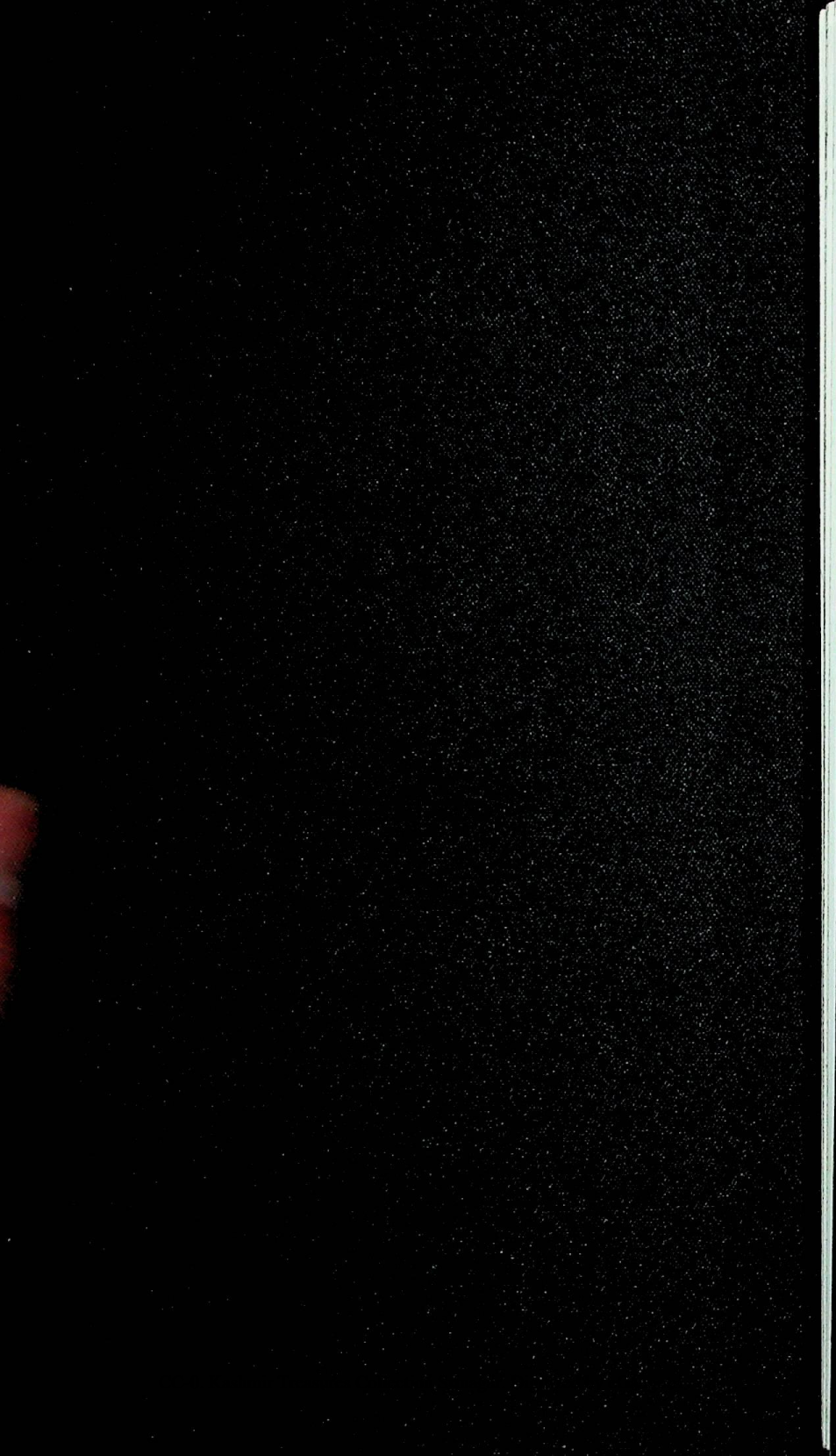
ماہنامہ

شیرازہ

سری نگر، کشمیر

جلد:۵۵　　صوفی غلام محمد نمبر　　شمارہ:۲_۳

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق: عادل کمپیوٹرس، سرینگر

ISSN نمبر : 2277-9833

اشاعت : فروری۔ مارچ 2017ء

قیمت : ۵۰/ روپئے

''شیرازہ'' میں جو مضامین اور تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

(ادارہ)

☆......خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی، سرینگر، کشمیر۔ 190008

ای میل: salimsalik2012@gmail.com

saleemsaghar123@gmail.com

فون نمبرات: 9419072288 - 9419711330

فہرست

حصۂ : دوم-(کشمیری افسانوں کے تراجم)

....

حرفِ آغاز

جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی بڑی شاندار تاریخ رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ریاست کے مختلف حصوں سے قریب ڈیڑھ سو اُردو روزنامے ہفت وار اور ماہنامے شایع ہوا کرتے تھے۔ بعض وجوہات کی بنا پر کشمیر کے مقابلے میں جموں میں اردو صحافت پہلے پھلی پھولی اور آگے بڑھی۔ اِس کے برعکس کشمیر میں صحافت کا چلن ذرا دیر سے ہوا۔ یہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں کا معاملہ ہے۔ کشمیر میں صحافت کو ادارہ جاتی شکل دینے، اِسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرانے، استحکام بخشنے اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو جِلا بخشنے کے لئے جن شخصیات نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اُن میں خواجہ ثناء اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد کی خدمات زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ دونوں حضرات نے صحافتی زندگی کا آغاز تقریباً ایک ہی دور میں کیا۔ پہلو بہ پہلو آگے بڑھے، مشکلات اور دقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے ریاست میں اُردو صحافت کو فروغ دیتے رہے۔ دونوں حضرات بالآخر محض چند ایام کے تفاوت سے اِس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

مذکورہ دونوں شخصیات کی وفات کے فوراً بعد اکیڈیمی نے اِن پر شیرازہ کی خصوصی اشاعتوں کا فیصلہ کیا تاکہ اُن کے ہم عصروں سے مضامین لکھوا کر ایک تاریخی دستاویز معرضِ وجود میں لائی جاسکے۔ آج سے قریب دو برس قبل خواجہ ثناء اللہ بٹ پر شیرازہ کی اشاعت خصوصی منظرِ عام پر لائی گئی جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ صوفی غلام محمد پر شیرازہ کی اشاعتِ خصوصی کا کام پہلو بہ پہلو چل رہا تھا لیکن چند وجوہات کی بنا پر اِس میں کسی قدر تاخیر ہوگئی اور اس دوران ہمیں اِس بات کا شدّت کے ساتھ احساس ہوگیا کہ۔

ترے جہان میں ایسا نہیں کہ پیار نہ ہو
جہاں اُمید ہو اس کی، وہاں نہیں ملتا

بہر حال، جس قدر مواد ہمیں دستیاب ہوسکا ہے، وہ نذرِ قارئین ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ صوفی صاحب پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور یقیناً لکھا بھی جائے گا۔ آج ہم حق ادائی کے جذبے کے تحت یہ سوغات آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے ایک بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

کشمیر میں اردو صحافت کی بنیادیں استوار کرنے اور اس کے ارتقا کے سفر کو آگے بڑھانے میں جن شخصیات کا کردار قابلِ قدر رہا ہے اُن میں صوفی صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ آپ خود اچھے ادیب تھے اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ مادری زبان کے تئیں اُن کا والہانہ لگاؤ تھا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔ اُن کا اخبار ہر سوچ اور ہر نظریئے کے لئے وقف تھا جو اُمراء، سیاسی حلقوں اور طلبہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ تاجروں، چھاپڑی فروشوں اور سماج کے کمزور طبقوں کے لئے بھی وقف تھا۔ یوں اُنہوں نے سماج کے ہر طبقے میں اخبارات کو مقبولِ عام بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُن کے اخبار میں کارٹون کی مستقل اشاعت اور اس کی وساطت سے عوام کے جذبات کی عکاسی اور مختلف مسائل کی تصویر کشی، صوفی برادران کا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ صوفی صاحب اخباری دُنیا میں بڑے تجربہ کار تھے۔ وہ صحافت کی نزاکتوں سے بخوبی واقف اور اخبار کے کاروباری پہلوؤں اور اس کے تقاضوں کا بھی پورا پورا ادراک رکھتے تھے۔

ادارہ اُن تمام مقالہ نگار حضرات کا مشکور ہے جنھوں نے ہماری گزارش پر اپنے مقالات ہمیں ارسال کئے۔ عزیزی محمد سلیم سالکؔ، سلیم ساغرؔ اور محمد اقبال لون نے حسبِ روایت بڑی محنت سے اِس اشاعتِ خصوصی کا خاکہ تیار کیا۔ صوفی غلام محمد کے بعض مقبولِ عام افسانوں کا اُردو ترجمہ زیرِ نظر اشاعت میں شامل ہے جسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

اِس اشاعتِ خصوصی کے بارے میں ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

سرینگر: ۲۸/مارچ ۲۰۱۷ء ☆......محمد اشرف ٹاک

☆......غلام نبی خیال

صوفی غلام محمد - ایک بے باک صحافی

میں جب بھی ریاست میں اردو صحافت وثقافت کے حوالے سے بات کرتا ہوں تو مجھے بے ساختہ مرحوم صوفی غلام محمد یاد آتے ہیں۔ ان کا تقابلی مطالعہ اگر ایک اور قد آور صحافی، آفتاب کے بانی مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ سے کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ صوفی کو اس لحاظ سے ثناء اللہ پر فوقیت حاصل تھی کہ صوفی ایک اخبار نویس ہونے کے ساتھ ایک پختہ فکر کشمیری افسانہ نگار بھی تھے۔

آج سے ساٹھ سال قبل کشمیر میں اردو اخبار نویسی سرکاری مصلحتوں کے ماتحت تھی، اخبار نویس کو یا تو حکومتی پسند و ناپسند کے مطابق اپنی تحریروں کو مرتب کرنے کا غیر اعلانیہ حکم تھا یا بصورت دیگر انہیں شاہی عتاب کا ایک یا دوسری صورت میں شکار ہونا پڑتا تھا۔ صوفی صاحب وقت کے اصحابِ اقتدار کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اس نافرمانبرداری کے نتیجے میں اُنہیں اُس وقت عتاب زدہ بھی ہونا پڑا جب گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں ''سری نگر ٹائمز'' پر پابندی عائد کی گئی۔ صوفی نے پھر بھی ہار نہیں مانی اور مرزا محمد افضل بیگ کو اپنا دفاعی وکیل مقرر کر کے سرخروئی سے مقدمہ جیت لیا اور صرف دو ماہ کے تعطل کے بعد یہ اخبار دوبارہ منظر عام پر آگیا۔

اسی طرح 1980 کے آس پاس کا ایک اور واقعہ صوفی غلام محمد کی آزاد خیالی اور

بیباکی کی دلالت کرتا ہے۔ میں اُن دنوں ہندوستان کے مقبول عام انگریزی رسالے ''انڈیا ٹوڈے'' کا مقامی نمائندہ تھا۔ ریاستی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس جاری تھا کہ ایوان میں چند بدزبان اراکین نے اس موقر ایوان میں اپنی جہالت کا مظاہرہ کر کے اسمبلی کو ایک مچھلی بازار میں تبدیل کیا جس میں اخلاق، شعور اور ادب کے سارے اصول اور قواعد بالائے طاق رکھے گئے۔ سری نگر ٹائمز کے کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر نے چند کارٹونوں کے ذریعے اس بے ہنگم طریق کار پر اپنے تیکھے طنز کی زبردست چوٹ کی۔ ایک کارٹون میں بشیر نے چند ایسے ممبران کو ایک کوڑے دان میں سر کے بل گرا ہوا دکھایا۔ یہ سبھی کارٹون حاصل کر کے جب میں نے ''اندیا ٹوڈے'' میں بھی ان کارٹونوں کے ساتھ ایک مضمون لکھا تو اس نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایوان میں زبردست شور شرابہ ہوا اور مدیر ''سرینگر ٹائمز'' کے خلاف استحقاق کی تحریک پیش کی گئی۔ صوفی صاحب کو جواب دہی کے لئے بہ نفس نفیس ایوان میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔

شیخ محمد عبداللہ بحیثیت وزیر اعلیٰ ایوان کے لیڈر تھے۔ صوفی صاحب ایوان میں آئے۔ اُن کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے ایوان میں ایستادہ ہو کر اپنے طویل جواب میں ان ناخواندہ ممبران پر اپنی ملامت کے تیر برسا کر انہیں بارِ دگر اس طرح رسوا کیا کہ وہ بغلیں جھانکنے لگے اور چند ایک تو ایوان سے کھسک بھی گئے۔ صوفی صاحب نے کہا کم ظرف لوگ جب عوام کے نمائندے بن کر ایوان میں داخل ہوتے ہیں تو وہ قوم کے ماتھے پر ایک داغ بن جاتے ہیں۔

اب تو سبھی کا یہی خیال تھا کہ صوفی صاحب معافی کے خواستگار ہوں گے یا ان کی بہرحال سرزنش ہوگی۔ صوفی صاحب نے اپنا بیان ختم کیا اور بیٹھ گئے۔ سارے ایوان پر مکمل خاموشی طاری تھی گویا ایوان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد شیخ صاحب اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے اور حاضرین کی توقع اور اندازے کے برعکس انہوں نے نہ صرف صوفی صاحب کی جرأت حق گوئی کو سراہا بلکہ یہ بھی کہا کہ ''سری نگر ٹائمز'' کے برمحل کارٹون غیر

مہذب اور ناشائستہ اراکین کے لئے چشم کشا کا کام دے سکتے ہیں۔ صوفی صاحب کو الزام سے باعزت بری کیا گیا۔

صوفی غلام محمد بنیادی طور پر ایک ادیب تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی محفلوں میں انہوں نے اپنی مادری زبان میں لکھے ہوئے کئی افسانے سنائے اور داد و تحسین حاصل کی۔ ان کا مشہور افسانہ ''ژِنہٕ ژۄر'' (کوئلہ چور) ایک بہترین تخلیق کی صورت میں زبان زد ہوا اور اسے اردو میں منتقل کئے جانے کے بعد ریاست سے باہر کئی جرائد نے توصیفی القاب کے ساتھ شائع کیا۔ صوفی صاحب کی تصانیف میں افسانوی مجموعہ ''شیشہ تہٕ سنگستان'' اور ''لوسمتی تارکھ'' (ڈوبے ہوئے تارے) شامل ہیں۔ یہ کتاب اُن خاکوں پر مشتمل ہے جن میں کشمیر کے اُن زندہ و جاوید کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے جو ہمارے سماج میں وہ سبھی کام انجام دیا کرتے تھے جنہیں سرانجام دینا اصحابِ دِل یا معزز شہری اپنے لئے باعث ہتک تصور کرتے تھے۔ ان خاکوں کے کردار سماج کے وہی مفلوک الحال اور بے کس لوگ تھے جو محلوں اور گلی کوچوں میں آوازیں لگا لگا کر قسم قسم کی اشیاء اور کھانے پینے کی چیزیں فروخت کر کے مقامی آبادی کو راحت بہم پہنچاتے تھے۔

بعد میں صوفی صاحب نے صحافت کا پیشہ اختیار تو کیا لیکن ادب کے ساتھ ان کی فکری وابستگی ہمیشہ قائم رہی۔ چنانچہ جب انہیں ریاست کی قانون ساز کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا تو انہوں نے اپنے حلقہ انتخاب کے لئے مختص کردہ رقم کا اچھا خاصا حصہ اُن مقامی ادیبوں کی کتابیں خریدنے پر صرف کیا جن کی تصانیف گھروں کی الماریوں میں دیمک خوردہ ہو رہی تھیں۔

صوفی غلام محمد نے صحافت کا پیشہ اخبار ''خدمت'' کی ملازمت سے شروع کیا۔ وہاں بھی ان کا ادبی ذوق اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اس اخبار کے لئے کشمیری میں طرحی مشاعروں کی باقاعدہ اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس اقدام کو ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ان مشاعروں میں

باقاعدگی سے شریک ہونے والے چند ایک تو بعد میں اچھے خاصے سخن ور بن گئے۔

اسی پس منظر میں صوفی صاحب اخیر تک ادبی اور ثقافتی تقریبوں، مباحثوں اور مناظروں میں برابر شرکت کرتے رہے جہاں ان کے مرتبے کے مطابق اُن کی پذیرائی ہوتی رہی۔

صوفی غلام محمد اور خواجہ ثناء اللہ بٹ نے اپنے اخباروں کو چہیتی اولاد کی طرح پالا پوسا اور ان کی پرورش اور پرداخت میں رات دن ایک کر کے انہیں شہرت کے بامِ عروج پر پہنچایا۔ اس حوالے سے 1984ء کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب بڈشاہ پل کے ساتھ واقع ''سری نگر ٹائمز'' کے دفتر میں آگ لگ گئی تو صوفی صاحب کو کسی چیز کی تلافی کا غم نہیں ہوا۔ وہ صرف اس اندیشے سے دل ملول تھے کہ کل کا اخبار کیسے شائع ہوگا۔ انہوں نے آو دیکھا نہ تاؤ اور آگ کے شعلوں اور جلتی ہوئی سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے دفتر کی اُس الماری تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے جس میں کاتبوں کے وہ مخصوص قلم رکھے ہوئے تھے جن کے بغیر کوئی اخبار مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ قلم بھی مشکل سے کتب فروشوں کے ہاں دستیاب تھے۔ اس طرح صوفی صاحب اور ان کے عملے نے قریب ہی کی ایک دکان میں بیٹھ کر اخبار تیار کیا جو اگلی صبح حسب معمول بازار میں دستیاب تھا۔

آخر پر صوفی صاحب اور ''سرینگر ٹائمز'' کا ذکر شائد نامکمل رہے گا اگر اُن کے برادر بشیر احمد بشیر کی بات نہ کی جائے جس کے توجہ طلب اور معنی خیز کارٹون بہت حد تک اس روزنامے کی مقبولیت اور شہرت کا باعث بنے ہیں اور بن رہے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بشیر صاحب، اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود، سالہا سال سے یہ کارٹون بلاناغہ ''سری نگر ٹائمز'' کی زینت بناتے آئے ہیں۔

☆☆☆
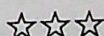
☆......نور شاہ

صوفی غلام محمد ۔ بحیثیت افسانہ نگار

کشتیوں کی بستی جو ڈل جھیل کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اپنے روپ، اپنے انداز اور اپنے پُرکشش ماحول کی وجہ سے ہر ہر لمحہ، ہر ہر نظر بہت پیاری لگتی ہے۔ ہر موسم میں یہاں زندگی ایک نئے سرے سے شروع ہوتی ہے اور اپنے اختتام پر اَن مٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے اور وہ نقوش ایک نئے زاویئے کے ساتھ ایک نئے موسم میں جذب ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ رواں دواں ہے۔ اِسی ڈل جھیل کے کنارے بلیواڑ روڑ نامی سڑک کے ایک جانب بہت سارے مکان نظر آتے ہیں۔ کچھ بڑے کچھ چھوٹے، کچھ شاندار، کچھ رنگین،۔ ہاؤس بوٹوں کی ایک لمبی قطار بھی دکھائی دیتی ہے۔ بلیواڑ نامی سڑک کے ذرا اندر ایک اور سڑک ہے جو اولڈ گگری بل روڑ نام سے جانی جاتی ہے۔ اِس سڑک کے دونوں جانب جگہ جگہ مکان اور دوکانیں ہیں اور اِن ہی مکانوں میں مسجد شریف سے ذرا آگے ایک بڑا مکان صوفی منزل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ مکان گزشتہ پچاس برسوں سے کشمیر کے چند معروف و نامور صحافیوں کا مسکن رہا ہے۔ اِسی مکان میں مرحوم صوفی غلام محمد بھی رہتے تھے۔

صوفی صاحب ایک ادیب تھے، ایک صحافی تھے اور اِس کے علاوہ دوستوں کے دوست تھے۔ دوستی نبھانا خوب جانتے تھے۔ اگر چہ بنیادی طور پر صوفی صاحب ایک افسانہ نگار تھے لیکن صحافتی دنیا میں ایک صحافی کی حیثیت سے اِس قدر چھائے رہے کہ اُن کی

افسانوی صلاحیتیں صحافتی صلاحیتوں میں پوشیدہ ہو کر رہ گئیں۔ اِس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ وہ اردو کے قلم کار تھے۔ اردو کے صحافی تھے، ساری عمر اردو لکھتے رہے اور پڑھتے رہے۔ اردو پڑھنا لکھنا اُن کی پیشہ ورانہ زندگی کی ایک ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر اردو صحافت سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں تک اُن کی افسانوی زندگی کا تعلق ہے وہ کشمیری زبان میں لکھتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ کشمیری زبان اُن کی پہچان ہے۔ اسی لئے افسانے لکھنے کے لئے انہوں نے کشمیری زبان کا ہی سہارا لیا اور اِسی زبان میں خوب سے خوب تر لکھنے کی جستجو کرتے رہے۔ اپنی اِسی جستجو میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے افسانوں میں زندہ جاوید کرداروں کی عکاسی کرنے کی کوشش کی۔ وہ ڈل جھیل سے تعلق رکھنے والی مغلی جو گلی گلی، بازار بازار مچھلیاں فروخت کرتی ہے یا ڈلگیٹ کی سڑک کے کنارے ساگ سبزی فروخت کرنے والی جانہ دید ہو۔ چونکہ ڈلگیٹ درگجن اُن کا آبائی علاقہ رہا ہے۔ وہ پیدا بھی اِسی علاقے میں ہوئے۔ اس لئے اُن کی کہانیوں کے اکثر کردار اِسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اُن کے بہت سارے کرداروں سے واقف ہوں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ صوفی صاحب کو کبھی کبھار اِن کرداروں کو پیش کرنے کے بعد مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار تو انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ بے گھر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک کہانی لکھی۔۔۔ کوئلہ چور (ژِنہِ ژۆر) یہ کہانی پڑھ کر اُن کے ایک بہت ہی قریبی رشتہ دار اِس قدر ناراض ہو گئے کہ صوفی صاحب کو اپنی ہمشیرہ کے گھر میں پناہ لینا پڑی۔ اُن کے اِس رشتہ دار کی ایک بیکری کی دکان تھی۔ صوفی صاحب نے اِسی بیکری میں کام کرنے والوں پر ہو رہے ظلم و ستم کو اپنی کہانی میں سمیٹ لیا تھا۔ اِن زندہ جاوید کرداروں کو اپنی کہانیوں میں پیش کرنے کی وجہ سے صوفی صاحب کے لئے مشکلات آتی رہیں۔ وہ اِن مشکلات کا ہنستے مسکراتے سامنا کرتے رہے لیکن وہ اپنی راہ پر چلتے رہے۔ زندگی کے بہت سارے گوشوں، بہت سارے پہلوؤں کی اِن زندہ جاوید کرداروں کے ذریعہ عکاسی کرتے رہے۔ واقعات و مناظر کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش

کرتے رہے۔ اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنے کرداروں کے ظاہر و باطن کو حقیقی انداز میں پیش کریں۔

1962ء میں اُن کی ایک کتاب ''لۄسۍمتۍ تارکھ'' منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب دراصل زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ کرداروں کی عکاسی کرتی ہے۔ اِس کتاب میں شامل اپنے افسانوی کرداروں کے بارے میں صوفی صاحب نے لکھا ہے:

> ''یہ سارے کردار زندہ جاوید ہیں۔ کشمیری زبان میں خاکہ نگاری کی تاریخ زیادہ پُرانی نہیں۔ ہر زمانے، ہر دور میں کچھ نمایاں کردار نظر آتے ہیں۔ یہ کردار نہ مرتے ہیں اور نہ ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ایسے کردار میری نظروں میں سماج کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں!''

صوفی صاحب کی اِس کتاب میں ایک افسانہ نما خاکہ ''جانہ دید'' کے عنوان سے شامل ہے۔ جانہ دید درگجن بازار میں ڈل کی سبزیاں فروخت کرتی تھی۔ اِس علاقے کا شاید ہی کوئی فرد ہو جو جانہ دید کی صورت و سیرت سے واقف نہ تھا۔ اِس افسانہ نما خاکہ سے چند سطور:

> ''جانہ دید بیوہ تھی لیکن بچوں والی اور داماد والی بھی۔ یوں تو جانہ دید کا خاوند برسوں پہلے فوت ہوا تھا مگر جانہ دید کا کلیجہ دیکھئے کہ دو چار آنسو بہانے کے بعد رونے دھونے سے کنارہ کشی اختیار کر کے دوسرے کاموں میں جُٹ گئی کچھ اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ بچوں کو کبھی محسوس نہ ہوا کہ اُن کا باپ مر گیا ہے!''

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں صوفی صاحب ڈل جھیل کے کنارے رہتے تھے۔ اِس لئے ڈل جھیل کا پسِ منظر اُن کی بہت ساری کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ڈل کے باسیوں کی اندر کی کہانی لکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ڈل جھیل کے پسِ منظر میں اُن کی ایک

کہانی ''گنجا'' (کھوُر) کافی مقبول ہوئی۔ایک گنجا ہر روز صبح سویرے ڈل جھیل میں نہانے آتا ہے۔روز ہی قریب کے ایک ہاوس بوٹ میں قیام پذیر ایک میم صاحب کی نظریں اُس کے تابنے کی طرح چمکتے ہوئے سر پڑتی ہیں اور اُسے اُبکائی آنے لگتی ہے۔ایک روز یہی میم صاحب ایک دوکان میں کشمیری پیپر ماشی کا کام دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی ہے وہ دست کاروں سے ملنا چاہتی ہے۔

دیکھئے صوفی صاحب کی اِس کہانی کا کلائمکس۔۔۔!

''اب میم صاحب کھڑکی کے قریب تھی۔ایک گوشے میں چار آدمی نظر آرہے تھے۔اِن کے ارد گرد رنگ، برش اور دوسرا سامان پڑا تھا۔وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔میم صاحب اُن کے ہاتھوں کی کرشمہ سازی دیکھتی رہی۔پھر دکان دار نے ایک کاریگر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''میم صاحب یہی ہمارا آرٹسٹ ہے، ہمارا فنکار۔۔۔کاریگر۔۔۔!

میم صاحب کی نظریں اس پر پڑیں تو ایک بار پھر اپنی آنکھیں مسلنے لگی اور پھر گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ایک دبی دبی سی چیخ ابھرتی۔گنجا۔۔۔گنجا۔۔۔میم صاحب نے صاحب کو تھام لیا۔۔۔''یہ وہی ہے جو صبح سویرے ہمارے ہاوس بوٹ کے سامنے نہانے آتا ہے۔۔۔گنجا۔۔۔میم:

وہی گنجا جس سے دیکھ کر میم صاحب کو متلی ہونے لگتی تھی اب ایک عظیم فن کار کی صورت میں اس کے سامنے تھا!''

چونکہ صوفی صاحب نے مکمل طور پر صحافتی زندگی کو اپنا لیا تھا اور وہ بے حد مصروف رہتے تھے اس وجہ سے انہوں نے بہت کم افسانے قلم بند کئے لیکن اُن کے تحریر کردہ افسانے زندگی کے حالات وواقعات سے اِس قدر قریب ہیں کہ اُن کو کبھی بھی، کسی بھی سطح پر نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا ہے۔صوفی صاحب کے افسانوں کی ایک بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ اِن افسانوں کے ذریعہ وہ بڑی سادگی کے ساتھ اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔صوفی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں لیکن جب کبھی بھی اور جہاں بھی کشمیری افسانے کی بات چلتی ہے تو صوفی صاحب کا نام سامنے آتا ہے۔آج بھی اُن کے افسانے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی کسی مخصوص طبقے یا مخصوص نظریئے کی تبلیغ نہیں کی بلکہ وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تلاش کرتے رہے۔دیکھئے اپنی کہانی ''دیواریں'' میں انہوں نے جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے ہوئے رحیم خان اور دھرم سنگھ کے بچپن اور لڑکپن کی زندگی کو کس انداز سے پیش کیا ہے۔جنگ میں حصہ لیتے ہوئے دھرم سنگھ بیس برس بعد اپنی بستی میں لوٹ آتا ہے جہاں اس نے جنم لیا تھا۔جہاں اس کے بچپن کا یار رحیم خان رہتا تھا اور جہاں رحیم خان نے تقسیم ملک کے وقت اس کی جان بچائی تھی لیکن آج جنگ میں رحیم خان کے خلاف لڑ رہا تھا۔دونوں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے ہوئے زخمی ہو چکے تھے۔ دیکھئے اِس کہانی کا اختتام۔۔۔!

> ''دفعتاً ایک دھماکہ ہوا۔گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔آگ پھیلتی گئی۔افسر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔دھرم سنگھ کے بہت سارے ساتھی مر چکے تھے۔ہر طرف شور بپا تھا، ہر سمت دھواں بکھرا ہوا تھا۔ دھرم سنگھ کا سپاہی جاگ پڑا۔وہ بھی آگے بڑھا اور ایک خندق میں گھس گیا۔وہاں پہلے ہی ایک سپاہی موجود تھا۔دونوں ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ایک دوسرے پر گولی چلانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ایک گولی چلی، پھر دوسری گولی چلی۔۔۔ پھر بندوقیں خاموش ہو گئیں۔۔۔ دونوں سپاہی ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے دونوں زخمی تھے۔ خون بہہ رہا تھا۔پھر ایک آواز آئی۔۔۔''دھرم سنگھ تم۔۔۔'' دوسری

جانب بھی آواز آئی ۔۔۔ ''رحیم خان تم ۔۔۔'' شاید اب دونوں کے

درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی!''

صوفی غلام محمد نے ہمیشہ اپنے افسانوں کے ذریعے زندگی کو صحیح معنیٰ دینے کی کوشش کی اور معاشرے کی گرتی ہوئی دیوار کو کھڑا رکھنے کے عمل میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور وہ بھی فنکارانہ اسلوب اپنا کر۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کی وفات کے بعد بھی محبت بھری یادوں کے ساتھ اُن کا نام لیا جاتا ہے۔

☆☆☆

☆☆☆

☆......مشعل سلطانپوری

صوفی غلام محمد۔ کشمیری زبان کا ایک ترقی پسند افسانہ نگار

ترقی پسند ادبی تحریک برصغیر کی زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان میں ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے بھی نیک فال ثابت ہوئی۔ کشمیری ادب میں کئی نئی اصناف داخل ہوگئیں، جن میں افسانہ سرِ فہرست ہے۔ کشمیری افسانہ نگاری کے پس منظر پر نظر ڈالتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف بے محل نہ ہوگا کہ اردو افسانہ نویسی نے شروع میں اس کے لئے میدان ہموار کرلیا تھا اور کشمیری افسانہ نگار پہلے اردو یا ہندی میں افسانے لکھنے کی مشق کر چکے تھے۔ اس ضمن میں علی الخصوص پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در جیسے اردو میں افسانہ لکھنے والوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ پریم ناتھ در حلقہ ارباب ذوق لاہور سے وابستہ ادیبوں سے متاثر تھے تو پردیسی پریم چند اسکول کے افسانہ نویسوں کے زیر اثر نیم اصلاحی اور رومانی افسانے لکھتے ہوئے ترقی پسندوں کے حلقے میں آگئے۔ ترقی پسند افسانوں کے پہلے مجموعہ ''انگارے'' سے متاثر ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''جب ترقی پسند مصنفین کی پہلی کتاب ''انگارے'' کے نام
> سے شائع ہوئی تو مجھے شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ جو کچھ میں

نے آج تک لکھا ہے، سب بے کار ہے۔ کیوں کہ اس میں رومان
کے سوا کچھ نہ تھا۔"[1]

پردیسی نے خود نہ صرف اُردو زبان میں ترقی پسند افسانے لکھے بلکہ کشمیر میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن قائم کرنے میں بھی پہل کی اور پھر جب کشمیر کلچرل محاذ قائم ہوا تو اس کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ کلچرل محاذ کی سرگرمیاں اگرچہ وقتی تھیں لیکن کلچرل کانگریس اور کشمیر کلچرل کانفرنس کے تحت سنجیدگی سے ادب تخلیق کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ ادیبوں کی باضابطہ اور باقاعدہ ہفتہ وار میٹنگیں ہونے لگیں اور ان میں نئی تخلیقات پر بحث ومباحثے ہوتے رہے۔

صوفی غلام محمد اسی دور کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے ادبی اصناف میں افسانہ کا میدان طبع آزمائی کے لئے منتخب کیا۔ وہ اگرچہ بعد میں یہ میدان چھوڑ کر صحافت کی طرف آ گئے لیکن اُس دور میں لکھے گئے ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ "شیشۂ تۂ سنگستان" اور "لوٗسۍ متۍ تارکھ" اُردو میں ان کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔ "پتھروں میں آبگینے" اور "ڈوبے ہوئے تارے"۔ ان دونوں مجموعوں میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں سے کئی افسانے نقادوں کی نظر میں کریکٹر اسکیچ اور خاکوں کی ذیل میں آتے ہیں۔

میری نظر میں "پتھروں میں آبگینے" مجموعہ کا افسانہ "جوبن کا جنازہ" واقعی ایک خاکہ ہی کہلایا جاسکتا ہے، جس کا مناسب عنوان "مہدہ بابا" ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح احمد ریشی ایک کریکٹر اسکیچ ہے نہ کہ افسانہ۔ اس مجموعہ میں "مال دید" نام کا افسانہ کریکٹر اسکیچ اور افسانہ کی درمیانی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسرے مجموعے میں شامل "جان دید"، "رمضانا بوڑھا" اور "پرکاش کول" کریکٹر اسکیچ ہیں اور علی نائی، نور شالہ اور سلطان تولہ کرداری افسانہ قبیل کی چیزیں ہیں۔

صوفی صاحب کے یہ تمام افسانے، خاکے اور کریکٹر اسکیچ، ان کے ترقی پسند نظریۂ

[1] بجھتے چراغ، پریم ناتھ پردیسی۔ تعارف از محمد صادق۔ مکتبہ لالہ رخ سری نگر، اگست ۱۹۵۵ء۔

ادب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنے مزاج اور اپنی سوچ کے اعتبار سے وہ پورے ترقی پسند دکھائے دیتے ہیں۔ وہ دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح کہیں بھی رومانیت اور حقیقت پسندی کے درمیان ڈولتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

''ڈوبتے ہوئے تارے'' جو اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا اور انہیں ادبی حلقوں میں متعارف کرنے کا باعث بنا، میں کرداروں کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اچھے لوگ، انسانیت سے پیار کرنے والے لوگ اب آہستہ آہستہ ختم ہورہے ہیں۔ صوفی ان کرداروں کو اپنے تمدن کا حصہ سمجھتا ہے اور وہ کشمیری سماج کی نئی زندگی میں ان کرداروں کی اہمیت محسوس کراتا ہے۔ یہ کردار جو ایثار، انسان دوستی، ہندو مسلم بھائی چارہ اور ایک دوسرے کے کام آنے کی اعلیٰ اقدار کے حامل تھے، حسین زندگی کے لئے نہایت ناگزیر ہیں۔ ''نور شالہ'' کردار میں پرانے اقدار کی مسماری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس افسانہ کے پس منظر میں مطلق العنان حکومت کے دور میں کشمیریوں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے، جب انہیں زور زبردستی زمین جوتنے کے کام پر لگا کر کسانوں کے شمار میں لاتے ہوئے بیگار دینے کے لئے گلگت کی طرف بھیجا جاتا تھا، یہ جانتے ہوئے کہ ان کا وہاں سے زندہ لوٹنا ناممکن ہے۔

شخصی حکومت کے دوران سرکاری کارندوں کے ذریعے بے چارے دیہاتیوں پر جو ظلم وستم توڑا جاتا تھا، اُس کی تصویر ''سلطان تولہ'' میں پیش کی گئی ہے۔ عوام کے استحصال اور اُن کی بے چارگی کی پوری نمائندگی اس میں ملتی ہے۔ اس افسانہ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ڈراماؤں اور ناٹکوں کے ذریعے استحصال پر طنز کرنے سے ہی دل کا غبار نکل جاتا تھا یعنی احتجاج کی ایک صورت اُس زمانہ میں بھی موجود تھی، جس کا اندازہ آج کل بھی بانڈ پاتھر (بھگت ناٹکوں) سے ہوسکتا ہے۔ ''علی نائی'' عنوان کے افسانہ میں پیشہ ورانہ رشک ورقابت کے ساتھ ساتھ اس بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ غربت اور افلاس آدمی کو طرح طرح کی کمزوریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چوری، فریب، کینہ اور حسد جیسی

برائیاں اس کی طبیعت کا جُز بنتی ہیں۔

صوفی کے دوسرے افسانوی مجموعہ میں جو "شیشہ تہ سنگستان" (پتھر اور آ بگینے) نام سے ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا، چھ افسانے شامل ہیں۔ اس کے پیش لفظ میں صوفی نے ادب اور افسانہ سے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"ہر ادب اپنے گرد و پیش اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے، یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قاری اپنے زمانے اور اپنے ماحول کی تصویر دیکھتا ہے۔ افسانہ ادب کی ایک نازک صنف ہے۔ یہ صنف ہر جگہ اپنے مخصوص رنگ اور مخصوص انداز سے پیدا ہو کر نشو و نما پاتی ہے۔ کشمیر میں افسانہ ایک نئی چیز ہے۔ ایک معمولی بات، افسانہ میں پیش ہو کر قاری پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور یہ اثر زندگی کو توانائی بخشتا ہے۔ افسانہ زندگی سے جتنا قریب ہوگا اور جتنا حقیقت پر مبنی ہوگا، اُسی قدر قاری کو متاثر کرے گا۔"

اُس وقت تک کشمیری زبان میں لکھے گئے افسانوں سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"اب تک کشمیری زبان میں کُل چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اختر محی الدین کے دو مجموعے، ستھ سنگر تہ سونزل (سات پہاڑیاں اور دھنک) اوتار کشن رہبر کا افسانوی مجموعہ تبرک اور بنسی نردوش کا افسانوی مجموعہ بالکا مرنہ جاؤں (بال مرایو)۔ کئی دوسرے دوست بھی اپنے افسانوں کی اشاعت کی کوشش کر رہے ہیں اور میرا یہ افسانوی مجموعہ، پانچواں ہے۔ اس میں سات افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک لکھے گئے ہیں۔ یہ سارے افسانے ادبی انجمنوں میں پڑھے گئے ہیں۔ قارئین نے انہیں پسند کیا ہے اور یہ مجھے خود بھی پسند ہیں۔"

اُن کے اس پیش لفظ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُن کے لکھے ہوئے کئی افسانے گلریز اور کونگ پوش نام کے رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں اور یہ افسانے خود اُن کے ذریعے اردو زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ کشمیری زبان کی اس نوزائیدہ صنف سے متعلق اُن کا خیال ان لفظوں میں ادا ہوا ہے:

''میرے یہ افسانے کیا کچھ سامنے لاتے ہیں۔ زندگی اور ماحول کے کون سے راز ہائے سربستہ بے نقاب ہوتے ہیں، اس بارے میں کچھ کہوں گا نہیں، البتہ یہ کہوں گا کہ کشمیری زبان میں افسانہ عمر کے لحاظ سے ابھی طفلِ شیر خوار ہی ہے، لیکن اُس سے کچھ ایسے اطوار سامنے آئے جن سے اُسے بالغوں کی صف میں جگہ ملی ہے۔ کشمیری افسانہ نے بہت کم عرصہ میں جو معیار قائم کیا، اُس نے ہمیں شادان و فرحان کیا ہے۔''

صوفی ادب کے لئے تنقید کی اہمیت کے معترف ہیں۔ ادب کی صحیح رہنمائی اور اس کی صحت مند نشو و نما کے لئے تنقید کا اُن کی نظر میں کیا مقام ہے، خود ان کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

''ایک جاندار ادب کے پنپنے کے لئے بے لاگ تنقید کا ہونا لازمی ہے۔ ایسی تنقید ادب کے گلستان میں لاجواب پھول کھِلانے کا باعث بنتی ہے۔ اگر ہمارا ادب تنقید سے آزاد رہا تو اسے راہِ راست ملنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ کچھ اس قسم کی تحریریں معرضِ وجود میں آئیں گی جو اسے بلندی کی طرف لے جانے کی بجائے پستی میں دھکیل دیں گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ تخلیقِ ادب کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیاں اور خامیاں بتانے والے بھی سامنے آتے رہیں اور آگے بڑھتے رہیں۔''

تنقید کے وجود اور اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے وہ تنقید نگاروں کے منصب اور اُن کی کارکردگی کا بطریق احسن پورا ہونے کو نہیں بھولتے۔ تنقید کا منصب فرض شناسی اور ایمان داری کا طالب ہے۔ اس لئے اُن کے خیال میں نقاد کو اس سے بے بہرہ نہیں ہونا چاہئیے۔ اُن کے لفظوں میں:

> ''وہ مصلحتوں کا شکار نہ ہوں، جو کچھ ایمانداری سے محسوس کریں، وہی لکھیں اور اپنی رائے بے جھجک اور بے باک ہو کر سامنے لائیں۔''

کچھ لوگوں کو کشمیری زبان اور اس کے ادب سے ''خدا واسطے کا بیر'' شروع ہی سے رہا ہے، نہ صرف پرایوں میں بلکہ اپنوں میں بھی یہ علت دیکھی گئی ہے۔ صوفی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''کشمیری ادب کے معترض عموماً وہی لوگ نظر آتے ہیں جو دراصل یہ تحریریں پڑھ نہیں سکتے۔ اگر یہ ذرا توجہ سے کشمیری میں لکھی گئی عبارتیں پڑھنے کی مشق کریں اور روانی سے پڑھنا سیکھیں تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ کشمیری افسانہ یا ناول اسی طرح پسند کریں گے جس طرح اُردو، ہندی یا انگریزی زبانوں کے افسانے اور ناول پسند کرتے ہیں۔''

صوفی کے شیشہ تہ سنگستان (پتھر اور آبگینے) میں شامل افسانوں میں ''مال دید'' عنوان کے افسانے میں ایک غریب اور محنت کش عورت کی ہمت اور جفاکشی کو داد دی گئی ہے۔ اس افسانہ کا مال دید نام کا کردار، ایک عورت کی سلیقہ مندی، کام کاج اور کاروبار میں اعلیٰ درجہ کی مہارت اور اُس کے بے داغ کردار کی تصویر سامنے لاتا ہے۔ اُس کا شوہر شک و شبہات میں مبتلا ہو کر اُسے گھر پر روکتا ہے اور خود اُس کی جگہ ساگ بیچنے نکلتا ہے تو چند دنوں میں سارا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ ایک دن مال دید اُسے پھر کاروبار سنبھالنے کی اجازت

دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اس مقصد سے کہ اُس کے شوہر کے شبہات بھی غلط ثابت ہوں اور کاروبار بھی اپنی ڈگر پر آجائے۔ وہ شوہر سے اجازت لے کر پھر ساگ کا ٹوکرا سر پر اٹھائے بازار کا رُخ کرتی ہے اور چند ہی دنوں میں کاروبار پھر چمک اٹھتا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل ''یاوُن تہ تاوَن'' (نوجوانی اور مفلسی) افسانہ میں فارغ البالی اور افلاس کا مقابلہ دو کرداروں کے ذریعے واقعات کی بافت سے قاری کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ غریبی اور افلاسی سے انسان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ شیلا کا باپ شمبھوناتھ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود جوان دکھائی دیتا ہے اور مہدہ نام کا باغوان جسے شروع سے وہ مہدہ بب کے نام سے پکارتے تھے، جوان ہونے کے باوجود بابا بنا رہتا ہے۔

''گنجا'' نام کا افسانہ اس سچائی کا عکاس ہے کہ جہاں کشمیر کے ہنرمندوں کی ہنر مندی بے مثال ہے، وہاں اُن کی افلاس زدہ زندگی کی صورت حال خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ ولایت سے آئی ہوئی اور صبور کے ہاوس بوٹ میں ٹھہری ہوئی انگریز عورت اور اُس کا شوہر، ڈل کے پانی میں غوطہ زن گنجے کو دیکھ کر ہاوس بوٹ چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کا جی متلاتا ہے۔ لیکن یہی جوڑا جب پیپر ماشی کے عمدہ نمونے دیکھ کر عش عش کرنے لگتا ہے اور اس کاریگر سے متعارف ہونا چاہتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ فنکار وہی گنجا ہے جسے غوطہ لگا کر دیکھتے ہوئے انہیں متلی ہونے لگی تھی تو وہ حیرت سے دم بخود ہو جاتے ہیں۔

''نوش لب اور عجب ملک'' (ایک رومانی کشمیری مثنوی ''گلریز'' کے دو کردار، ہیرو اور ہیروین) افسانہ، نچلے طبقے کے ایک شادی شدہ جوان جوڑے کی افلاس زدہ زندگی سے متعلق ہے۔ زندگی کی تلخیاں انہیں ایک دوسرے سے لڑنے پر مجبور کرتی ہیں لیکن اُن کی باہمی محبت کے سوتے خشک نہیں ہوتے اور یہ محبت انہیں غریبی کے کڑوے گھونٹ پینے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ ''نہ معلوم کیوں'' افسانہ ایک شادی شدہ نوجوان لڑکی کی نفسیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں بھی تخیل کی جگہ واقعیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس افسانہ میں جانی

اور زونی کے کرداروں کے ذریعے حقیقت نگاری کا ایک بے مثال نمونہ سامنے آتا ہے اور واقعات کے بیان میں سرمو بھی انحراف نظر نہیں آتا۔ کشمیری عورتوں کی روایتی شرم و حیا کی عمدہ تصویر پیش کی گئی ہے۔

اس مجموعہ میں شامل افسانہ ''ژِنہِ ژوٗر'' کا ترجمہ تو ''کوئلہ چور'' ہی ہوسکتا ہے اور میں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند کشمیری ادب'' میں ژِنہِ ژوٗر کا ترجمہ کوئلہ چور ہی کیا ہے۔ جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اور لنگویجز کے اہتمام سے شائع شدہ ''پربت اور پنگھٹ'' نامی کی کتاب کی دوسری جلد میں بھی، جو ڈوگری اور کشمیری افسانوں کے اردو ترجموں کا ایک مجموعہ ہے، میں بھی، اس کا ترجمہ ''کوئلہ چور'' ہی کیا گیا ہے۔ خیر افسانہ نگار صوفی اس سے کیا مراد لیتا ہے۔ افسانہ کے کرداروں کے ذریعے اس کی کچھ وضاحت ہوسکتی ہے۔ اس افسانے کے کردار ہیں سلطان صوفی، نانبائی، اُس کا مختلف قسم کی روٹیاں بنانے کا کارخانہ ہے۔ یہ آج کی بیکری نہیں، روایتی تنور میں سینکی جانے والی روٹیاں ہیں۔ غنی اور عبداللہ نام کے دو مزدور اس کارخانہ میں کام کرتے ہیں۔ ایسی ویسی اُجرت پر، خون پسینہ ایک کرکے کام کرتے ہیں۔ غنی کا کام تھا آٹا گوندھنا، خمیر تیار کرنا، تنور سلگانا، پیڑے بنانا اور ان پر تل یا خشخاش لگانا۔ عبداللہ لکڑیاں تیار کرتا، تنور میں ڈالتا، تل صاف کرکے دھوتا، پانی بھر کر لاتا اور تختہ صاف کرتا۔ محمد و اُن کا اُستاد تھا۔ یہ تنور میں روٹیاں بنا بنا کر سینکتا تھا۔ پہلے اس کا باپ قادر یہاں کام کرتا تھا۔ اب اُس کی وفات پر اُس کا بیٹا محمد و یہاں آگیا تھا۔ یہ لوگ اپنی تنخواہ بھی سلطان صوفی کے پاس جمع کرتے تھے۔ کھانے اور کپڑوں کے علاوہ مزدوروں کو بارہ روپے مہینہ تنخواہ ملتی تھی۔ جی توڑ محنت پر مالک کی ڈانٹ ڈپٹ، گالیاں اور پھٹکارنا قابلِ برداشت تھی لیکن ان کو جیسے یہ سب کچھ سننے اور برداشت کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ سلطان صوفی ان کا خوب استحصال کرتا تھا، کچھ نقصان ہوتا تو اس پر جرمانہ، جمع کی ہوئی تنخواہ کے حساب میں ہیرا پھیری، دوا دارو میں خرچہ سے زیادہ لگانا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب سے محمد و یہاں آیا تھا، حالات کچھ بدلنے لگے تھے۔ محمد و نے اسے ایک بار گالی دینے پر خبردار کیا

تھا کہ یہ بات برداشت نہیں ہوسکتی۔ اس سے دونوں مزدوروں کو بھی حوصلہ ملا تھا۔ لیکن اصل میں وہ بزدل تھے۔ جب محمد و ان سے کہتا کہ گالی برداشت نہیں کرنی چاہئے تو وہ مسکرا کر جواب دیتے "کیا فرق پڑتا ہے جی، گالی تھوک تو نہیں جو چپک جائے"۔ "ایک دن سلطان صوفی آٹا لانے کے لئے گاؤں چلا گیا تھا۔ اس دن محمد و نے دل کھول کر غنی اور عبداللہ سے باتیں کی تھیں۔ اُس نے ان سے کہا تھا۔ "تم بھی کوئلہ چور بن گئے ہو؟"۔ "کوئلہ چور، انہوں نے حیران ہو کر دہرایا تھا۔" محمد و نے انہیں یوں سمجھایا "کہ جب شیر جنگل سے نکل کر کسی گاؤں میں داخل ہوتا ہے تو گاؤں والے شور مچاتے ہیں "کوئلہ چور آ گیا، کوئلہ چور آ گیا۔ مارو، مارو۔ اپنا یہ نیا نام سن کر شیر ساری شیخی بھول جاتا ہے، وہ تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور وہ دُم دبا کر بھاگتا ہے۔ یہ دراصل گاؤں والوں کی زبردست چال ہوتی ہے۔ اگر وہ شور مچائیں، شیر آیا، شیر آیا، بھاگو تو شیر کو اپنی طاقت کا احساس ہوگا اور وہ سارے گاؤں کو تہس نہس کر دے گا۔ وہ اُن سے کہتا تھا۔ اُس نے تمہیں بھی کوئلہ چور بنا دیا ہے۔ تمہیں اپنی طاقت کا احساس نہیں ہے۔ اگر تم میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو سلطان صوفی تمہیں کبھی گالی دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بارہ روپے دے کر تمہارا خون نہیں چوس سکتا۔ چیتھڑوں اور تھوڑے سے ساگ بھات کے بدلے خرید نہیں سکتا۔" لیکن جب سلطان صوفی تاڑ جاتا ہے کہ اس فتنہ کی جڑ محمد و ہے تو وہ اُسے نوکری سے نکال دیتا ہے اور غنی اور عبداللہ سر جھکائے اپنا کام کرتے رہتے ہیں تو اُن کو دیکھ کر محمد و کہتا ہے "کوئلہ چور"۔۔۔ سلطان صوفی کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ کوئلہ چور کا کیا مطلب ہے۔

ترقی پسند ادب کی رو سے تینوں مزدوروں کو کام بند کر کے کارخانہ سے نکل جانا چاہئے تھا اور مالک پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات منوانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں اسی وجہ سے یہ افسانہ ترقی پسند افسانہ کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ یہ اُس زمانہ کے مزدوروں اور مظلوموں کے نیم پختہ انقلابی شعور کی غمازی کرتا ہے۔ یہ لوگ نہ اپنی طاقت کا پورا احساس رکھتے تھے اور نہ حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت۔

صوفی غلام محمد نے کارخانے کی حالت مالک کی سنگدلی اور خودغرضی، مزدروں کی نفسیات اور اُن کی ناگفتہ بہہ حالت کی دل دوز اور پُر تاثیر تصویر کشی کی ہے۔صوفی کے افسانے کشمیر کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔اُن کے افسانوں کا ماحول تخیلی نہیں۔وہ پلاٹ سے زیادہ کرداروں پر زور دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کے افسانے اکثر خاکے بن کے رہ جاتے ہیں۔اُن کے کردار مٹی کی مورتیں نہیں، جیتے جاگتے کردار ہیں، جوخوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی بنا پر بالکل حقیقی نظر آتے ہیں۔صوفی نادار اور دولت مند، مفلس اور سرمایہ دار، غریب اور امیر کو ٹکرا کر ایک کی شکست اور دوسرے کی فتح کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔وہ ایک خاص تناظر کو پیش کرتا ہے جس میں غریب اور مظلوم سے قاری کے دل میں فطری طور پر ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اس نظام سے نفرت ہونے لگتی ہے جس نے عام لوگوں کی طبقاتی تفریق کی بنا پر قابلِ رحم زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔

صوفی کی زبان افسانہ نویسی کے لئے مناسب ہے اور نثر کے لئے موزوں۔وہ سیدھی سادی سلیس اور بامحاورہ زبان ہے۔وہ فطری طور پر ایک نثر نویس ہیں۔کشمیری ادب کی تاریخ (کاشرِ ادبک توأریخ) کے مولفین اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ''صوفی کی انفرادیت'' اس کی نثر میں ہے جو کسی جگہ مصنوعی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ صاف اور خالص افسانوی نثر ہے۔''

☆☆☆

☆......طاہر محی الدین

صوفی غلام محمد......کچھ یادیں، کچھ باتیں

صوفی غلام محمد مرحوم سے میرا بطور صحافی ملنا جلنا بھی رہا اور رابطہ بھی۔ واضح رہے کہ میں نے صحافتی پیشہ کی شروعات ''آفتاب'' سے کی ہیں۔ یہ 70 کی دہائی تھی، ان دنوں سرینگر سے صرف دو نمایاں اخبار شائع ہوتے تھے، آفتاب اور سرینگر ٹائمز۔ ان دونوں کے درمیان رابطہ نہ تھا۔ دونوں کے درمیان ظاہری طور پر نہیں البتہ ایک خاموش طرح کی معاصرانہ چشمک تھی۔ مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ پورا دن دفتر میں رہتے تھے، اس کے برعکس صوفی صاحب گھومنے پھرنے کے عادی تھے۔ اس زمانے میں لالچوک میں واقع ہوٹل اوبرائے سیاسی مباحثوں کے لئے مشہور تھا۔ صوفی صاحب بھی اکثر وہاں وارد ہوتے تھے اور محفل جماتے تھے۔ میری صوفی صاحب سے غالباً پہلی ملاقات ''آفتاب'' سے رخصتی اور ''چٹان'' شروع کرنے کے بعد سفر کے دوران ہوئی۔ دراصل سرینگر سے کچھ صحافی شاید کسی کانفرنس کے سلسلے میں دہلی جارہے تھے۔ ان میں صوفی صاحب اور میں بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ صوفی صاحب ایک بڑا پرنٹر ساتھ لئے ائر پورٹ پہنچے تھے جس کو وہاں اٹھانے اور بک کرنے میں میں نے ان کا ہاتھ بٹایا۔ معلوم ہوا کہ ان کے دفتر کا پرنٹر خراب تھا اور سرینگر میں مرمت ممکن نہ تھی لہٰذا وہ اسے مرمت کے لئے دہلی لے جارہے تھے۔ صوفی صاحب باقاعدگی سے کام کرنے کے عادی تھے۔ دہلی میں ہمارا قیام کشمیر ہاوس میں تھا، وہ

روزانہ باقاعدگی سے ایڈیٹوریل تحریر کرتے تھے اور کشمیر ہاؤس کے باہر واقع ایک دکان پر جا کر اسے سرینگر دفتر کو فیکس کرواتے تھے۔

ہمارا ساتھ لندن سفر میں بھی رہا۔ یہ غالباً 2004 کی بات ہے یورپ میں مقیم کچھ کشمیری گروپوں نے لندن میں ایک کشمیر کانفرنس کا اہتمام کیا تھا اور ریاست کے متعدد سیاستدانوں کے علاوہ کچھ صحافیوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ان دنوں لندن میں ہی مقیم تھے اور کانفرنس میں آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ مولوی افتخار انصاری کو اپنے ساتھ لندن لے گئے تھے۔ مولوی صاحب ہمارے ساتھ کانفرنس میں شریک تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح سابق پاکستانی وزیر اعظم مرحوم بے نظیر بھٹو نے کیا تھا۔ ہمارا قیام ہوٹل میں تھا اور اکثر ہوٹل لابی میں گپ شپ چلتی تھی۔ جموں کے بھیم سنگھ ایک گروپ لے کر کانفرنس میں آئے تھے۔ ان کی خاتون سیکریٹری بھی ساتھ تھیں جو ان کا رسالہ "Voice of Millions" تیار کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ لابی میں مختلف لوگوں سے سوال پوچھ رہی تھیں۔ صوفی صاحب بھی وہاں موجود تھے چنانچہ محترمہ نے ان سے سوال کیا "آخر اس کانفرنس کا مدعا و مقصد کیا ہے؟ صوفی نے برجستہ جواب دیا "یہ سب مسئلہ کشمیر کی عنایت ہے، اسی مسئلے کی وجہ سے ہمیں لندن کی سیر کرنے کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔ مسئلہ کشمیر جاری رہنا چاہیئے، اس کی برکت سے بیرونی سیاحت کے اور موقعے بھی ملیں گے؟"

صوفی صاحب سے آخری ملاقات، ان کی وفات سے کچھ عرصہ قبل ہوئی۔ ماہ رمضان میں کسی افطار پارٹی میں بشیر احمد بشیر (کارٹونسٹ) سے ملاقات ہوئی تو میں نے صوفی صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں اور آج کل صنعت نگر والے مکان میں قیام پذیر ہیں۔ چند روز بعد میں ان کی عیادت کے لئے وہاں گیا۔ صوفی صاحب نے بتایا کہ وہ ڈاکٹروں کے مشورے پر ہی صنعت نگر منتقل ہوئے کیونکہ بچھوارہ کے مقابلے میں یہاں قدرے کھلی ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ آج کل اپنی سوانح قلم بند کر رہے ہیں اور اس کا بڑا حصہ مکمل ہو گیا ہے۔

اس ملاقات کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب پہلے ان کے صورہ انسٹی چیوٹ میں ایڈمٹ ہونے اور پھر اچانک انتقال کرنے کی اطلاع ملی۔ معلوم نہیں کہ ان کی سوانح کا کیا ہوا؟ توقع ہے کہ ٹائمز گھرانہ اس کی اشاعت کو ممکن بنانے کے لئے قدم اٹھائے گا۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ صوفی صاحب کی سوانح حیات تاریخی اعتبار سے معلومات کا خزانہ ہوگی کیونکہ لگ بھگ گزشتہ نصف صدی کے دوران انہوں نے کشمیر کے حالات و واقعات اور یہاں کے سبھی چھوٹے بڑے سیاسی کرداروں کو قریب سے دیکھا ہے۔

بطور صحافی صوفی غلام محمد ایک جہاندیدہ شخص تھے۔ وہ اپنے فکر و خیال میں کسی ابہام کے شکار نہ تھے۔ عسکری دور میں بھی ان کے اداریئے بڑے جرأت مندانہ ہوتے تھے۔ اس دور میں صحافیوں کے لئے حالات اچھے نہیں تھے۔ صوفی صاحب نے عملی طور پر دفتر بڈشاہ چوک سے اپنے گھر واقع بچھوارہ منتقل کر دیا تھا۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ صوفی غلام محمد اور خواجہ ثناءاللہ بٹ ہم عصر تھے، ایک طرح سے حریف بھی تھے مگر دونوں ساتھ ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کے تعلقات کی نوعیت عجیب تھی۔ آفتاب نے پہلے آفسیٹ پرنٹنگ شروع کی۔ صوفی صاحب کہاں پیچھے رہتے، چنانچہ انہوں نے شیخ باغ میں آفسیٹ پرنٹنگ پریس لگوایا اور اس کا افتتاح آنجہانی اندرا گاندھی سے کروایا جو ان دنوں اپوزیشن میں تھیں لیکن آفتاب اور ٹائمز میں حریفانہ دوڑ کے ساتھ خاموش مفاہمت بھی تھی۔ مثلاً اگر آفتاب کا کوئی کاتب کام چھوڑ دیتا تو اُسے سرینگر ٹائمز میں کام نہیں دیا جاتا تھا۔ کشمیر کے ایک خوشنویس شبیر احمد رضوی مرحوم کو بھی اس تجربہ سے گزرنا پڑا۔ وہ آفتاب کے ہیڈ کاتب اور بڑے ہنر مند خوشنویس تھے۔ ان کی شادی ہوئی تو چھٹی پر رہے، جو خواجہ صاحب کی نظر میں زیادہ لمبی تھی۔ اس بات پر انہوں نے کوئی تلخ بات کہہ دی تو شبیر اٹھ کر چلے گئے۔ میں ان دنوں آفتاب میں تھا اور مجھے واقعی شبیر کے جانے کا بہت افسوس تھا۔ چند روز بعد وہ لالچوک میں ملے تو میں نے ٹائمز میں کام کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں کوشش کر چکا ہوں مگر وہ مجھے لینے پر آمادہ نہیں۔ بالآخر لگ بھگ ایک ماہ کے بعد

شبیر آفتاب میں واپس آ گئے۔ اس میں کسی حد تک میری کوشش کا بھی دخل تھا۔ شبیر رضوی فنی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ وہ آفتاب کی شہ سرخی کی نوک پلک سنوارنے میں کافی وقت صرف کرتے تھے۔ مگر شبیر عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات فنِ خوشنویسی کے لئے بڑا نقصان ہے۔ ماضی میں کئی مرتبہ کشمیر پریس کی کوئی نمائندہ تنظیم بنانے کی کوشش ہوئی۔ اس ضمن میں کئی بار سینئر مدیروں کی میٹنگیں ہوئیں، جن میں خواجہ صاحب، صوفی صاحب اور دیگر صاحبان کے ساتھ مجھے بھی بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ مگر یہ سبھی کوششیں لاحاصل ثابت ہوئیں۔ جس کی ایک بڑی وجہ چند سینئر مدیروں کی انانیت تھی۔

صوفی صاحب اخباری دنیا میں بڑے تجربہ کار تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ''خدمت'' سے کیا تھا۔ چنانچہ وہ صحافت کی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے علاوہ وہ اخبار کے کاروباری پہلو اور اس کے تقاضوں کا بھی پورا ادراک رکھتے تھے۔ انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ صوفی صاحب بھی اس سے مبرا نہ تھے۔ تاہم مجموعی طور پر ان کی خوبیوں کا پلڑا بھاری تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

☆......منظور انجم

صوفی غلام محمد - باوقار اُردو صحافی

کشمیر میں اردو صحافت کی بنیادیں استوار کرنے اور اس کے ارتقائی سفر کو آگے بڑھانے میں جن چند شخصیات کا کردار سب سے نمایاں رہا ہے ان میں صوفی غلام محمد کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ جس وقت صوفی صاحب کی ادارت میں روزنامہ سرینگر ٹائمز کا اجرا ہوا کشمیر میں اردو کے کئی اخبارات شائع ہورہے تھے جن میں روزنامہ آفتاب عوام میں کافی مقبول تھا۔ روزنامہ ہمدرد کا بھی اپنا ایک حلقہ قارئین تھا جبکہ روزنامہ خدمت، روزنامہ مارتنڈ اور دیگر کئی اخبارات بھی شائع ہوتے تھے۔ روزنامہ آفتاب کے بانی خواجہ ثناء اللہ بٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اخبار کو گھر گھر پہنچا کر لوگوں میں اخبار پڑھنے کی عادت پیدا کی۔ اُس وقت تک اخبارات سرکاری حلقوں، وزیروں اور بیروکریٹوں تک پہنچائے جاتے تھے اور ان کے علاوہ کچھ سیاسی قائد اور کارکن اخبار پڑھا کرتے تھے۔ عام لوگ جن میں پڑھے لکھے سرکاری ملازم بھی شامل تھے، اخبار پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ تاہم کشمیری پنڈت دہلی کے انگریزی اخبارات پڑھا کرتے تھے۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ نے عوام کو اخبار پڑھنے کی طرف راغب کرنے کیلئے تین اہم کام کئے۔ ایک تو اخبار کے گیٹ اپ میں دلکشی پیدا کر کے اسے جاذبِ نظر بنایا، دوم طنز و مزاح کے کالم جو وہ پہلے سے لکھا کرتے

تھے، میں مزید جدت پیدا کرتے ہوئے ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کے عنوان سے نیا کالم شروع کیا جو بعد میں مقبول ترین کالم بنا۔ سوم انہوں نے ہاکروں، تقسیم کاروں اور سٹالوں کا ایک نیٹ ورک قائم کیا جس سے کشمیر بھر میں لوگوں کیلئے روزانہ اخبار کا حصول ممکن ہوا۔ ان کی ان بے پناہ کاوشوں سے اخبار کی اشاعت میں اضافہ تو ہوا لیکن اس کے باوجود اخبار بینی ایک مخصوص طبقے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ کی کاوشیں جاری تھیں کہ ان ہی دنوں شمیم احمد شمیم کا ہفتہ روزہ آئینہ شائع ہوا جس کی معرکتہ الآرا تحریروں نے مختلف الخیال سیاسی حلقوں، طالب علموں، علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو بھی اخبار پڑھنے پر مائل کیا۔ اس طرح اخبار پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھتا رہا تاہم جب روزنامہ سرینگر ٹائمز شائع ہوا تو اخبار حکام، امراء، سیاسی حلقوں اور طلباء تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دکاندار، مزدور، چھاپڑی فروش اور دیگر طبقوں کے ہاتھوں میں بھی اخبار آ گیا۔ اس لئے صوفی غلام محمد کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے سماج کے ہر طبقے کو اخبار پڑھنے کا عادی بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صوفی غلام محمد نے کشمیر میں پہلی بار اخبار میں کارٹون متعارف کیا۔ انہوں نے اس کے لئے اپنے چھوٹے بھائی بشیر احمد بشیر کو تیار کیا۔ حالانکہ وہ آرٹ یا کارٹون کے فن سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ صوفی غلام محمد نے ان میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ وہ اچھا کارٹون بنا سکتے ہیں۔ بشیر احمد بشیر نے بھی غیر معمولی محنت اور لگن کے ساتھ کارٹون بنایا۔ وہ کارٹون بناتے تھے اور صوفی صاحب ان کے بنائے کئی کئی کارٹون مسترد کر کے نیا کارٹون بنانے کا حکم دیتے تھے۔ آدھی آدھی رات تک کارٹون بنانے کا کام جاری رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی ہفتوں کے اندر بشیر احمد بشیر کے کارٹونوں نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کئے۔ اب وہ ناخواندہ شخص بھی جسے اخبار کی سرخی کا ایک لفظ پڑھنے میں بھی کافی وقت لگتا تھا اخبار خریدنے لگا تا کہ کارٹون دیکھ سکے۔ دوسرا کام

صوفی غلام محمد اور نامور افسانہ نگار نُور شاہ
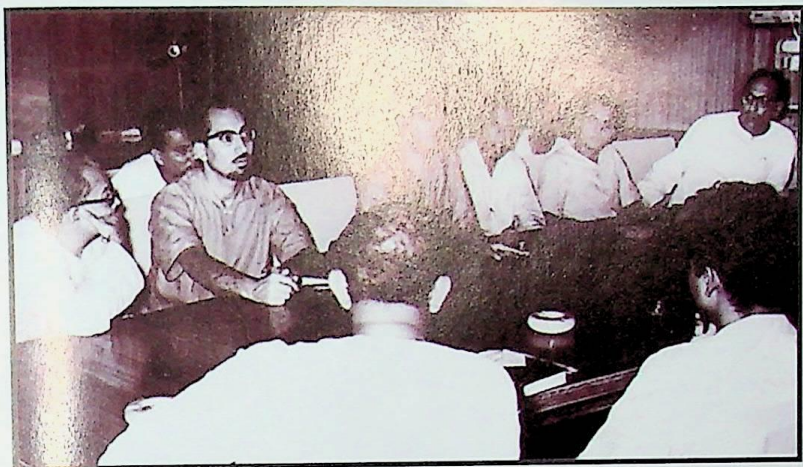
نامور صحافیوں کے ساتھ خیالات کا تبادلہ

صوفی غلام محمد اور شمیم احمد شمیم، سرکردہ ادیبوں کے ساتھ

خواجہ ثناء اللہ بٹ، صوفی غلام محمد اور میر واعظ مولوی عمر فاروق

پریس کی آزادی کے لئے صحافیوں کے ہمراہ مارچ
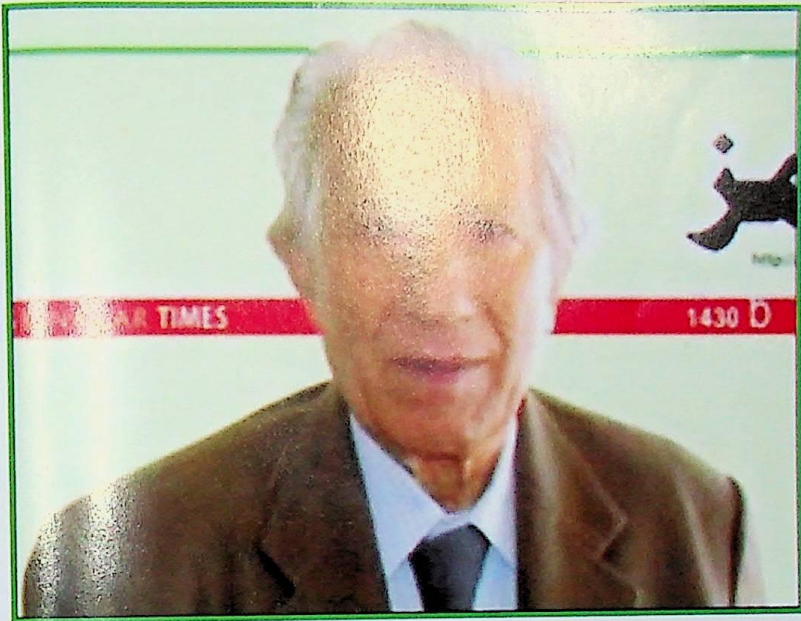
صوفی غلام محمد

صوفی غلام محمد کی نماز جنازہ؛ میر واعظ کشمیر مولوی عمر فاروق پیشوائی کر رہے ہیں

انہوں نے یہ کیا کہ مذہبی وسیاسی تنظیموں، ٹریڈ یونین تنظیموں، تجارتی تنظیموں وغیرہ کے بیانات اخبار میں شائع کئے۔اس سے اخبار کی آمدنی بھی بڑھ گئی اور ہر طبقہ اخبار کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے وابستہ ہوا۔ اسی دوران سرینگر ٹائمز کی وساطت سے کالم نویسوں کی ایک ٹیم تیار ہوئی جو مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرنے لگی۔ سرینگر ٹائمز سے پہلے اخبارات کی مجموعی اشاعت سینکڑوں کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ سرینگر ٹائمز کے بعد مجموعی اشاعت ہزاروں سے آگے بڑھی۔

اس تمہید کے بعد آیئے صوفی غلام محمد کی شخصیت اوران کی صحافتی صلاحیتوں پر بات کرتے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ انہوں نے خود سرینگر ٹائمز کیلئے بہت کم لکھا۔ تاہم اس بات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان کی نگاہ اور سوچ میں وہ وسعت ضرور تھی جو کسی اخباری ادارے کے سربراہ کیلئے معیاری اور معتبر اخبار کی تیاری کے لئے موجود ہونا لازمی ہے۔ وہ ایک بہتر منظّم تھے اوران کے اندر وہ حس بیدار تھی جو خبر کو پہچاننے کیلئے ضروری ہوتی ہے اور وہ اس فن سے بھی واقف تھے جو خبر کو تیار کرنے اور معتبر بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔ بچھوارہ ڈلگیٹ کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہونے والے صوفی غلام محمد کے اندر پیدائشی طور پر ایک ادیب موجود تھا۔ ضرورت اور روزگار کی تلاش نے اس ادیب کو صحافت کا پیشہ اپنانے پر آمادہ کیا۔ روزنامہ خدمت میں مراسلہ نگار کے طور پر انہوں نے شروعات کی بعد میں مرحوم بخشی غلام محمد نے جس وقت وہ وزیر اعظم کی کرسی سے محروم ہوئے تھے انہیں نیشنل کانفرنس کے آفیشل آرگن ''صدائے کشمیر'' کی ادارت سونپ دی۔ ''صدائے کشمیر'' جلد ہی مالی بحران سے دوچار ہونے کے بعد بند ہوا لیکن صوفی صاحب پہلے ہی بھانپ چکے تھے کہ اس اخبار کی عمر زیادہ نہیں اس لئے انہوں نے ہفت روزہ ''سرینگر ٹائمز'' کی اشاعت شروع کردی تھی۔ ''صدائے کشمیر'' بند ہونے کے بعد سرینگر ٹائمز روزنامہ ہوگیا۔ ایک مقبول روزنامہ ''آفتاب'' کی صورت میں موجود ہونے کے بعد نئے اخبار کیلئے عوام میں جگہ

بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔صوفی صاحب نے کارٹون میں جدت پیدا کی اور صوفی غلام محی الدین، جو ان کے بڑے بھائی تھے کو ایڈیٹوریل تحریر کرنے کا کام سونپا گیا۔صوفی محی الدین کے ایڈیٹوریل سیاسی حلقوں کے ساتھ ساتھ دانشور حلقوں میں بھی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

صوفی غلام محمد خود اچھے ادیب تھے اور ادبی ذوق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے ادبی تحریروں کو اخبار میں جگہ دے کر ادبی حلقوں کو بھی اخبار کے ساتھ وابستہ کیا۔ انہوں نے شعری مسابقے بھی شروع کئے جو اس وقت مقبولیت کے عروج بھی تھے۔ جب اندرا عبداللہ ایکارڈ عمل میں آیا۔ایک طرحی شعری مقابلے میں پلوامہ کے عبدالرحمان آزاد کی ایک غزل انہیں قارئین کے اصرار پر کئی بار شائع کرنا پڑی جس کا ایک شعر تھا۔

نظر کے آستانوں سے گزر کر جس کی تھی پرواز
مقامِ کبریا کھوکر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

صوفی غلام محمد کی ان ہی جدت طرازیوں نے سرینگر ٹائمز کو شہرت اور مقبولیت کے آسماں پر پہنچایا۔خود وہ ٹیلی ویژن کے مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے اور عوامی مسائل ابھارا کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی ذاتی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔وِہ مختلف تقاریب میں تقریریں کرتے تھے اور ایک اچھے مقرر کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر معاملے پر اپنی ایک الگ سوچ اور نظریہ رکھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنی سوچ کو اپنے اخبار پر حاوی ہونے نہیں دیا۔وہ اپنی تقریروں میں اپنی سوچ اور نظریہ بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کرتے تھے لیکن ان کا اخبار ہر سوچ اور ہر نظریئے کیلئے وقف تھا۔ وہ خود پہلے صفحے کی خبروں میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے لیکن اخبار کے ساتھ ان کے عشق کا یہ عالم تھا ہر صفحے کی پروف ریڈنگ خود کیا کرتے تھے۔ایک ایک لفظ پڑھتے تھے اور آدھی

رات کو بھی دفتر میں بیٹھ کر اسی کام میں مصروف ہوتے تھے۔ان کا اخبار کبھی کبھی صبح کو تیار ہوتا تھا۔اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے صحافتی کلچر کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا تو غلط نہیں ہوگا۔جس وقت وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے، اردو صحافت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی کیونکہ اردو صحافت تنزل کی طرف گامزن ہے۔ کہنے کو تو اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے لیکن اسے سرکار کے ہر ادارے سے بے دخل کر دیا گیا ہے اور اسے ہر حیثیت سے نظر انداز کیا جا رہا ہے گو کہ اب بھی اردو اخبارات کی مجموعی سرکولیشن ہی سب سے زیادہ ہے۔عوام اردو اخبارات پڑھتے ہیں لیکن اردو اخبارات میں کیا لکھا ہے یہ سرکاری حلقوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اردو اخبارات کو اشتہارات کی تقسیم میں بھی دوسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔صوفی غلام محمد جیسی شخصیت ان حالات میں اردو صحافت کا وقار اور اعتبار برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔
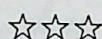
☆☆☆

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)
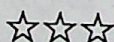
☆......وجیہہ احمد اندرابی

صوفی غلام محمد - یادوں کے آئینے میں

ماضی کے دریچوں سے بار بار جھانکنے کے باوجود مجھے مرحوم صوفی غلام محمد کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا احوال نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ روزنامہ ''خدمت'' کے دفتر میں شروع ہوا۔ لڑکپن کا زمانہ تھا، نویں جماعت کے طالب علم کے لئے مشاغل کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن یہاں تو قلم اور کاغذ سے دوستی ہوگئی تھی اور اُلٹا سیدھا لکھنا مشغلہ بن گیا تھا۔ روزنامہ ''آفتاب'' کے مدیرِاعلیٰ خواجہ ثناء اللہ کے پاس ان کے دفتر واقع مائسمہ ایک مراسلہ لے کر گیا تو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ حوصلہ افزائی کی کہ لکھا کرو اور اردو زبان کے ساتھ ریاستی حکومت کے سلوک کے تعلق سے مضمون لکھنے کی فرمائش بھی کی۔ اس طرح خواجہ صاحب کے ساتھ ایک تعلق قائم ہوا جو اُن کی موت تک قائم رہا۔

کچھ ایسی ہی کہانی مرحوم صوفی صاحب کے ساتھ تعلق کا سبب بنی۔ ایک مراسلے کے ساتھ اخبار ''خدمت'' کے دفتر میں ان کے روبرو پیش ہوا تو انہوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا برخوردار لکھتے رہو۔ اس دوران ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی ادارت میں لکھنو سے شائع ہونے والے مقبول ادبی ماہنامہ ''فروغِ اردو'' میں میری پہلی تحریر شائع ہوئی تو ایک نیا حوصلہ مِلا اور یوں میرے ادبی اور صحافتی سفر کا آغاز ہوا۔ موئے مبارک کی گمشدگی کے نتیجے میں شروع ہوئی تحریک کے نتیجے میں میرے قدم سیاست کے خاردار میدان میں نہ جانے

کب اور کس طرح بڑھ گئے جس کی وجہ سے میں نہ صرف صحافت بلکہ ادب سے بھی کسی قدر بے گانہ ہوگیا۔ 1965ء سے 1968ء تک زنداں کی نذر ہوگیا۔ باہر آیا تو کافی کچھ بدل چکا تھا۔ مرحوم صوفی صاحب ''خدمت'' کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ پھر وہ کچھ دیر تک بخشی صاحب کے اخبار سے وابستہ ہوئے۔ سیمابی طبیعت نے یہاں بھی سمجھوتے سے باز رکھا جس کے نتیجے میں ''سرینگر ٹائمز'' وجود میں آیا۔ تاج ہوٹل بڈشاہ کی اوپری منزل پر دفتر قائم کیا، جہاں دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ میں بھی بلاناغہ ان سے ملنے چلا جاتا۔ مالی مشکلات اگرچہ قدم قدم پر آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن رہی تھیں لیکن ہمتِ مرداں مددِ خدا کے مصداق انہوں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ درپیش مشکلات کا ذکر مجھ سے بھی کرتے اور پھر میری مغموم صورت دیکھ کر کہتے کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ واقعی وقت گزر گیا اور سرینگر ٹائمز نے ایک ننھے منے پودے سے ایک تناور اور مضبوط درخت کی شکل اختیار کر لی، جس کی چھاؤں میں بیٹھنے کی خواہش ان کے دوستوں کے ساتھ دشمنوں نے بھی۔

ان کے مراسم کے حوالے سے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ ہر شخص کو اس کے مزاج کے مطابق ہینڈل کرنا انہیں بخوبی آتا تھا۔ معروف صحافی مرحوم مقبول حسین کی خدمات ''سرینگر ٹائمز'' کے لئے حاصل کرنا اور پھر اس کی سیمابی اور لاابالی طبیعت کے باوجود اس سے کام لینا واقعی دل گردے کا کام تھا، جسے صوفی صاحب جیسا اٹل ارادوں والا شخص ہی انجام دے سکتا تھا۔

''آفتاب'' سے میرا تعلق اور کام کرنا ہمارے تعلقات میں حائل نہیں ہوا اور صحافی برادری کی بہبودی کی خاطر ہم مِل کر کام کرتے رہے۔ کشمیر ایڈیٹرس کانفرنس کے وہ عرصہ دراز تک صدر رہے اور اس دوران مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ چھوٹے اخبارات کے تئیں ان کا ہمدردانہ رویہ اور صحافیوں کو درپیش انفرادی مسائل کے حوالے سے ان کی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ حالانکہ کانفرنس کے ممبران میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا رویہ افسوس ناک ہوتا لیکن صوفی صاحب انہیں ساتھ لے کر چلنے کے ہُنر سے پوری طرح واقف تھے۔ اُنہوں

نے زندگی بھر انتھک محنت کی۔ علی الصبح گھر سے دفتر پہنچنا معمول بن گیا تھا جبکہ واپسی رات ڈیڑھ دو بجے ہوتی، اخبار کی کاپی پریس میں پہنچانے کے بعد۔ اُدھر ان کی وفا شعار اہلیہ محترمہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے شوہر نامدار کی منتظر رہتیں اور ان کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھاتیں۔

ناساعد حالات کے نتیجے میں انہیں ''سرینگر ٹائمز'' کا دفتر اپنے گھر بچھوارہ منتقل کرنا پڑا۔ رات کو دیر سے اخبار تیار ہوتا تو وہ کاپی لے کر خود ہی لال چوک پریس پر جاتے اور کسی بھی ملازم کو اس کام کی تکلیف نہ دیتے تا کہ جو کچھ بھی ہو ان ہی کے ساتھ ہو اور ملازم محفوظ رہیں۔

ایم ایل سی نامزد کئے گئے تو گھر پر ملاقات ہوئی اور بتایا کہ محض اس لئے ممبری قبول کی ہے کہ صحافی برادری کی خدمت کرسکوں اور درپیش مسائل حل کرانے کے حوالے سے کردار ادا کرسکوں۔

عمر کے آخری پڑاؤ پر شریکِ حیات کی جدائی ان کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ دُکھ سُکھ میں ساتھ دینے والی شریک حیات کی جدائی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی اور وہ بکھر سے گئے تھے۔ چنانچہ تھکاوٹ کے آثار چہرے پر نمایاں دکھائی دینے لگے تھے اور تھکاوٹ غالب آ گئی تھی۔ میں مزاج پرسی کیلئے گیا تو بہت خوش ہوئے اور ہم دیر تک گپ شپ میں مصروف رہے۔ کہنے لگے ''یار! تجھے تو معلوم ہے کہ میرا دن صبح سات بجے شروع ہوتا اور رات دو بجے ختم لیکن اب میرا دل کرتا ہے کہ بس آرام کروں۔ بستر چھوڑنے کا دل ہی نہیں کرتا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا جو ملنے چلے آئے، ٹائم پاس ہوتا جاتا ہے۔''

موت سے چند روز پہلے صوفی صاحب سے میری ملاقات صورہ میڈیکل انسٹی چیوٹ کے ایک مخصوص کمرے میں ہوئی جہاں انہیں بطور خاص رکھا گیا تھا۔ حالانکہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی تپاک سے ملے اور دیر تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ماضی میں بھی جھانکتے رہے اور حال کے حوالے سے بھی باتیں کیں۔ انہیں یا مجھے اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ حالانکہ کمزور دکھتے تھے لیکن خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا جذبہ بیماری

پر غالب تھا۔ پاؤں کسی قدر متورم تھے لیکن ڈاکٹروں کے مطابق یہ کوئی سیریس بات نہ تھی۔ امید یہی تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہو کر گھر لوٹیں گے۔ ڈاکٹروں کے معائنہ کے لئے کمرے میں آنے کے بعد میں ان سے رخصت ہوا اس وعدے کے ساتھ کہ کل پھر آؤں گا۔ افسوس وہ کل نہ آسکا اور صوفی صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

صوفی صاحب ایک صحافی کے علاوہ ایک ادیب بھی تھے۔ کشمیری میں اُنہوں نے کئی بہترین کہانیاں لکھی ہیں لیکن ان کی پہچان ایک معروف صحافی کی حیثیت سے تھی۔ انہوں نے صحافت کے میدان میں اپنی انتھک جدوجہد اور محنت سے جو مقام حاصل کیا آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحافت کے شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے باوجود ان میں غرور یا تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ صحافیوں کی نئی نسل سے ان کا حسن سلوک اور ان کے مسائل کے تیئں دلچسپی صحافی برادری میں ان کی مقبولیت کا سبب تھی۔ ان کے مراسم سبھی سے تھے۔ سینئر صحافیوں اور قلم کاروں سے بھی اور اس میدان میں قدم رکھنے والی نئی پود سے بھی۔ حوصلہ افزائی کرنا ان کا شیوہ تھا اور مفید مشورے دینے میں بخل سے کام لینا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نو آموز اور سینئر صحافیوں میں یکساں مقبول تھے۔ صوفی صاحب زندگی کی آخری سانس تک صحافت سے جُڑے رہے۔ شاید اس لئے کہ صحافت سے انہیں جنون کی حد تک محبت تھی۔ کشمیر میں صحافت کو فروغ دینے کے حوالے سے ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

☆......ڈاکٹر آفاق عزیز

صوفی غلام محمد: صحافی، ادیب اور سیاستدان

صوفی غلام محمد کی زندگی کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھی، جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اُن کے نزدیک رہے ہوں یا جن کی ان کے ساتھ نشست و برخاشت رہی۔ جب ایک انسان ہمہ گیر خصوصیات اور اوصاف کا مالک ہو تب اس کا خلاصہ کرنا اور بھی کٹھن ہوتا ہے۔ اسی دائرہ میں اگر صوفی غلام محمد کی شخصیت کو شامل کیا جائے تو حیرانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ صوفی غلام محمد کا نام راقم نے پہلی بار 1982ء میں اپنے باپ مرحوم غلام احمد بتو سے اُس وقت سنا جب مظفر آباد کے ریڈیو تراڑکھل مظفر آباد سے کشمیری موسیقار محمد سبحان راتھر انٹرویو دے رہے تھے۔ جس دوران اُنہوں نے صوفی غلام محمد کا نام سرینگر ٹائمنز سے جوڑ کر پیش کیا۔ پوچھے جانے پر راقم کے باپ نے وضاحت کی کہ محمد سبحان راتھر ہمارا ہمسایہ تھا۔ ایک دو منزلہ مکان، جس کی چھت گھاس سے بنی تھی، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''انٹرویو دینے والے کا یہی مکان ہے جو غربت کی جنگ ہارنے کے بعد 1965ء میں بھاگ کر مظفر آباد میں جا بسا''۔ یہ پوچھنے پر کہ محمد سبحان راتھر نے صوفی غلام محمد کا نام کیونکر لیا تو جواب یہ ملا کہ ''صوفی غلام محمد ہر اُس محفل میں شرکت کرتے تھے جہاں محمد سبحان راتھر خاص طور سے رتنی پورہ پلوامہ کے طنبوریوں کے ہمراہ گاتے اور ناچتے تھے۔ اسی پسِ منظر میں سوال پوچھنے والے کو محمد سبحان راتھر نے یہ جواب دیا کہ صوفی غلام محمد جیسی شخصیت بھی ان کی شیدائی تھی۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی غلام محمد کا نام جوانی کی دہلیز کو

چھونے کے ساتھ ہی قاری کو پچھاڑتے ہوئے نہ صرف دانشوروں، ادیبوں، سیاستدانوں، عالموں، فاضلوں، موسیقاروں بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ انسانوں کے کانوں میں گونجنے لگا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اُسے انسانی اقداراور انسانی قدریں بہت ہی پیاری تھیں۔ 80 کی دہائی میں شہر اور مضافات کے لوگ نمکین چائے کا مزہ لیتے ہوئے اخبار ''آفتاب'' اور ''سرینگر ٹائمز'' کی سُرخیاں زورزور سے پڑھتے تھے۔ سُرخیوں کا مزہ ہم بھی لیتے تھے لیکن دودن کے بعد جب سرینگر ٹائمز بذریعہ ڈاک ہمارے گھر حیات پورہ چاڈورہ پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار جب میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ ہمیں تین دن کے بعد سرینگر ٹائمز ملتا ہے اس کا کیا فائدہ ہے تو اُن کا کہنا تھا کہ میں نے ''سرینگر ٹائمز'' میں چھپنے والے مضامین اور اداریہ کو پڑھنے کے لئے یہ اخبار منگاتا ہوں۔ اس لئے اگر یہ اخبار تین دن کے بجائے پانچ دنوں کے بعد بھی ملے گا، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ٹائمز کے ساتھ اس دیرینہ وابستگی نے راقم کو اُس وقت صوفی غلام محمد کے قریب لایا جب 1988ء میں پرتاپ پارک کے مقام پر ''کشمیری اسٹوڈنٹس یونین'' جس کا میں صدر تھا، کے بینر تلے کشمیری زبان کو سرکاری زبان بنانے کے لئے بھوک ہڑتال شروع کی تھی جس میں محمد رفیع خان حضر تبلی، عبدالستار رنجور، مولانا فاروق، مکھن لال کنول، مکھن لال محو، موتی لال ساقی، غلام نبی شیدا، غلام نبی خیال اور صوفی غلام محمد سمیت سو کے قریب طلباء، دانشور، صحافی، سیاستدان اور دینی علماء شامل تھے۔ اگرچہ حکومتِ وقت نے کئی بار ہڑتال کیمپ پرشب خون مارنے کی کافی کوشش کی لیکن پرنٹ میڈیا بشمول آفتاب، وادی کی آواز، اذان، کشمیر ٹائمز اور خصوصاً سرینگر ٹائمز کے مدیر اعلیٰ صوفی غلام محمد کے اداریوں، مضامین اور سرخیوں نے سرکار کو کوئی سخت قدم اٹھانے سے بالکل باز رکھا تھا۔ اُن اداریوں، مضامین اور جلی سُرخیوں میں کشمیری زبان وادب اور ثقافتی ترقی وتحفظ کے حوالے سے آئینی وضاحت بھی کی جاتی تھی اور سرکار کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا جاتا تھا اور کبھی ان نوشتوں میں زیریں دھمکی بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح یہ بھوک ہڑتال اٹھارہ دنوں تک جاری رہی یہاں تک کہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بذاتِ خود پرتاپ پارک میں آئے اور اعلان کیا کہ اگلے

سال سے تمام تعلیمی اداروں میں کشمیری زبان کو ایک لازمی مضمون کے طور پر متعارف کیا جائے گا۔ بہرحال راقم کو صوفی صاحب کے ساتھ گہری وابستگی رہی ہے۔ یونیورسٹی سے گھر لوٹتے وقت میں ہفتے میں ایک بار ضرور صوفی صاحب سے ملتا تھا۔ یہ سلسلہ پہلے بڈشاہ چوک اور بعد میں شیخ باغ والے دفتر میں چلتا رہا۔ ان مُلاقاتوں کے دوران میں نے دیکھا کہ صوفی صاحب کشمیری زبان وادب، تمدن، موسیقی، ثقافت، تاریخ اور کشمیریت کے دلدادہ اور دیوانہ تھے۔ چونکہ وہ خود ایک افسانہ نگار تھے، اس لئے قلمکاروں کی چہ جائیکہ وہ شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نویس، ناول نگار، مضمون نویس، موسیقار، خطاط غرض کسی آرٹ یا فن میں مہارت رکھتا ہو، حد سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ میں نے آج تک کسی ادبی انجمن یا ادیب سے نہیں سُنا ہے کہ صوفی صاحب نے اپنی زندگی میں کسی قلم کار سے کوئی پریس نوٹ یا کوئی ذاتی مواد چھاپنے کے لئے پیسے لیئے ہوں۔ عام تاثر ہے کہ صوفی غلام محمد کو سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی جو عملی سیاست کے اعتبار سے صحیح ہے جس کا ثبوت یہ کہ جب 2002ء میں مفتی محمد سعید نے آپ کو ایم۔ ایل۔ سی بنایا تو آپ نے ادیبوں سے کشمیری اور اردو کتابیں خریدنے کا آغاز کیا۔ اس حوالے سے صوفی صاحب نے براڈوے ہوٹل میں ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں، صحافیوں اور دانشوروں کا ایک تاریخی جلسہ منعقد کیا جس میں وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید سمیت منگت رام شرما اور مظفر حسین بیگ بھی شامل تھے۔ اپنی تقریر میں صوفی صاحب نے بہ بانگ دہل اعلان کیا کہ ''میری کانسچونسی میرے ادیب اور شاعر ہیں جو میرے سامنے بہ نفسِ نفیس بیٹھے ہیں۔ میں بنڈ، نالی اور کوچہ بنانے کے بدلے اپنا سارا فنڈ کشمیری زبان وادب، ثقافت اور ادیبوں کی بہبودی کے لئے صرف کروں گا۔'' یہ الفاظ سنتے ہی مفتی محمد سعید کا چہرہ لال ہوا اور تُرنت بولے ''صوفی صاحب آپ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔'' صوفی صاحب بھی جوش میں آکر کہنے لگے ''میری کانسچونسی میرے ادیب، میری زبان اور ثقافت ہے۔ اگر میں یہ روپیہ اِن پر خرچ کرنے کا مجاز نہیں ہوں تو میں ایم۔ ایل۔ سی کا عہدہ چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔'' یہ بھی سچ ہے کہ جب کبھی کسی نو آموز سیاستدان کو صوفی صاحب کی ضرورت پڑی تو انہوں نے

اس کی بھرپور مدد کی۔ اس نوعیت کی درجنوں مثالیں ہیں جن کا میں سلطانی گواہ ہوں۔ ایک بار میں بچھوارہ میں صوفی صاحب کے گھریلو دفتر میں داخل ہوا۔ جہاں ایک جسیم اور قد آور شخص جس کے سر پر پٹی بندی تھی، اپنی بات سمیٹ رہا تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ کپواڑہ کا ایک آزاد امیدوار جس کا الیکشن مہم کے دوران مخالفین نے سر پھوڑ دیا تھا۔ اُس کی مانگ تھی کہ سر پھوڑنے والوں کے خلاف کاروائی ہونی چاہئے۔ دوسرے روز اس واقعہ کی ساری تفصیلات صوفی صاحب نے سرینگر ٹائمز میں شائع کی تھیں۔ نجی اور عوامی مجلسوں میں صوفی صاحب بار بار کہتے تھے کہ اُنہیں صحافی اور سیاستدان کہنے کے مقابلے میں ادیب کہلانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ سیاست جانتے نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اور لوگوں کی طرح صوفی صاحب کو بھی عالمی، ایشیائی، برصغیری اور خاص کر کشمیر کی سیاست کا گہرا شعور تھا۔ مگر باقی سیاستدانوں، صحافیوں اور دانشوروں کی طرح اپنی بات گھما پھرا کے اور مُبہم انداز میں پیش کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ''اے مشن اِن کشمیر'' نامی کتاب کے صفحہ ۷ا پر چھپے اقتباس سے ملتا ہے جس میں صوفی غلام محمد نے کتاب کے عالمی شہرت یافتہ جرنلسٹ اور سماجی مورخ مسٹر آندریو وائیٹ ہیڈ کو 7 مارچ 1997ء میں کشمیر اور ہند پاک تعلقات پر پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا تھا:

> ''دیکھئے میں کلکتہ (موجودہ کولکتہ) میں رہا ہوں، کیرلا گیا ہوں اور کراچی میں وقت گزارا ہے۔ میری شکل وصورت دیکھ کر وہ کہتے تھے کہ میں کشمیر سے آیا ہوں۔ مجھے سُننے کے بعد وہ کہتے تھے کہ آپ کشمیر کے باسی ہیں۔ میرا اردو بولنے کا انداز ہی کچھ الگ تھا۔ کلچر اور مذہب دو الگ چیزیں ہیں۔ کشمیریوں کو اپنے کلچر پر ناز ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے کشمیریوں کو کبھی عزت سے نہ دیکھا ہے اور نہ ان کی عزت کی۔ دونوں نے کشمیریوں پر بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی اور اِن کا کلچر تباہ وبرباد کیا۔''

آندریو وائیٹ صوفی صاحب کے حوالے سے ایک اور جگہ
رقمطراز ہے کہ ''کشمیر کے بیشتر لوگ خود مختار کشمیر کے خواہاں ہیں اگر
ہندوستان اور پاکستان ان کی خواہشات کا احترام کریں تو۔''
(اے مشن ان کشمیر، ص:۱۶)

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں صوفی غلام محمد نے قلم آزمائی شروع کی تھی۔ اُن کے مضامین وقت کے مشہور اردو اخبار ''خدمت'' میں چھپتے تھے۔ کئی مضامین سامنے آنے کے فوراً بعد صوفی غلام محمد کو اخبار ''خدمت'' میں بطور رپورٹر تعینات کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صوفی غلام محمد کا نام صحافتی اور ادبی حلقوں میں زبان زدِ عام ہوا۔ نیوز رپورٹنگ کے علاوہ صوفی غلام محمد نے ''بچھہِ کتھ'' نام کا کالم بھی شروع کیا تھا جو عوامی حلقوں میں کافی مشہور ہوا۔ ''خدمت'' اخبار میں چند سال گزارنے کے بعد 1969ء میں صوفی غلام محمد نے ''سرینگر ٹائمز'' نامی اپنا علاحدہ اخبار شروع کیا جس نے دفعتاً ایک بڑے ادارے کی شکل اختیار کی جو آج ہمارے سامنے موجود ہے، لیکن صوفی صاحب ہم سے دور بلکہ بہت دور چلے گئے۔ اُن کا قائم کردہ سرینگر ٹائمز ادارہ صوفی برادران خاص کر بشیر احمد بشیر، صوفی یوسف اور صوفی ساحل کی محنت و مشقت سے اُسی طرح رواں دواں ہے جس طرح صوفی غلام محمد کے زمانہ میں تھا۔ صوفی صاحب ایک ہردلعزیز شخصیت تھے۔ ان میں انسانیت، شجاعت، شفقت، برداشت جیسی صفات موجود تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ہر مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالنے میں ماہر تھے۔

☆......شبنم قیوم

صوفی غلام محمد - ایک تذکرہ

صوفی غلام محمد رشتے میں میرے ماموں لگتے تھے۔ان کی آبائی رہائش گاہ درگجن میں مشن ہسپتال روڈ پر تھی جو آج چسٹ ڈزیز ہسپتال کے نام سے جانا جاتا ہے(یہ رہائش گاہ آج بھی موجود ہے)۔صوفی غلام محمد کے والد صوفی عبدالرحیم کا درگجن ڈلگیٹ میں ملک ڈائری "Milk Dairy" کا کاروبار تھا۔ڈوگرہ شاہی کے دور میں سرینگر میں انگریز ریڈنسی کے ساتھ بے شمار انگریز یہاں مقیم تھے۔ان کے علاوہ انگریز سیلانیوں کی آمد و رفت سے ہوٹل، ہاؤس بوٹ اور پرائیویٹ کوٹھیاں اکثر بک رہتی تھیں۔صوفی عبدالرحیم کی فرم ان ہوٹلوں، کوٹھیوں اور ہاؤس بوٹوں میں مقیم انگریز ملازمین اور سیلانیوں کے لئے دودھ، دہی، مکھن کریم اور ملائی سپلائی کرتی تھی۔ان کا کاروباری خاندان خوشحال اور فارغ البال تھا۔

عبدالقیوم ریشی عرف شبنم قیوم کے والد عبدالرزاق ریشی جو بیرو علاقہ کے پوشکر نامی گاؤں کے کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے،صوفی عبدالرحیم کی ملک ڈائری میں ملازم تھے۔اصل میں انہی کے کندھے پر مِلک ڈائری کی ذمہ داری تھا۔عبدالرزاق ریشی بڑے محنتی، جفاکش اور ایماندار ملازم تھے اس بات کو مدنظر رکھ کر صوفی عبدالرحیم نے عبدالرزاق ریشی کو اپنی بڑی بیٹی فیضی کے نکاح میں دیا۔انہیں خانہ داماد کے ساتھ پسر پروردہ بھی بنایا۔

جب صوفی غلام محمد کی شادی بیاہ کا اہتمام ہوا، میری عمر اس وقت پانچ سال کی تھی البتہ پورے خاندان میں لارڈ پیار ملتا تھا،صوفی غلام رسول میرے ہم عمر اور ہم عصر تھے۔

صوفی غلام محمد کی شادی بیاہ کے موقعہ پر مجھے چھوٹا دلہا بنایا گیا اور مجھے ہار بھی پہنائے گئے۔ صوفی غلام محمد کو جب دلہا بنا کر گھوڑے پر بٹھایا گیا، مشعل بردار جلسوں اور بینڈ باجے کے ساتھ برات روانہ کی گئی تو اپنے ساتھ چھوٹے دلہا کو گھوڑے پر بٹھانے سے دلہا میاں نے انکار کر کے میرا دل توڑ دیا۔ میں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا، روتے پیٹتے جب میں نے آسمان سر پر اٹھایا تو مجھے ''دودھ موج'' کے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر روانہ کیا گیا۔ اس کو میں نے اپنی فتح سے تعبیر کیا۔ جب دلہا میاں سسرال پہنچا اور انہیں شامیانہ میں مسند تک لایا گیا تو مجھے پہلے ہی یہاں براجماں دیکھ کر وہ ٹھٹھک سے گئے۔

صوفی عبدالرحیم نے اپنے کاروبار کو وسعت دے کر ''مِلک ڈائری'' کا ایک یونٹ گلمرگ میں قائم کیا۔ اس یونٹ کا مالک و مختار عبدالرزاق ریشی کو بنایا۔ گلمرگ میں ''ملک ڈائری'' کا یہ یونٹ ایک سال بھی پورا نہ کر سکا کہ وادی کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کانگریس اور مسلم لیگ برسر پیکار تھی۔ انگریزوں نے ملک کی تقسیم کے ساتھ ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ پر جب اگست 1947ء میں عمل ہوا تو اسی سال اکتوبر میں قبائلی حملے کے سبب ریاست میں ڈوگرہ راج کا خاتمہ ہوا۔ اس نئی صورت حال میں جب ملک اور ریاست انگریزوں سے خالی ہونے لگی تو صوفی عبدالرحیم کی ''مِلک ڈائری'' کو زوال آ گیا۔

عبدالرزاق ریشی نے گلمرگ کا ''مِلک ڈائری'' کا یونٹ بند کر کے کارخانہ بند کیا اور واپس گھر کی طرف کوچ کر لیا۔ انہوں نے ''ملک ڈائری'' کی مشین ایک گھوڑے پر باندھ لی اور اپنے گھریلو سامان کو دوسرے گھوڑے پر لاد کر روانگی اختیار کر لی۔ جس گھوڑے پر مشین باندھ کر رکھی گئی تھی، اس گھوڑے کا چلتے چلتے پاؤں پھسل گیا اور وہ ایک گہری کھائی میں گر کر دم توڑ بیٹھا۔ گھوڑے کے ساتھ مشین بھی وہیں دفن ہوگئی۔ نئی صورت حال میں صوفی عبدالرحیم کا ''مِلک ڈائری'' کا کاروبار اور گلمرگ میں ان کا یونٹ بند ہونے سے پورا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔

سیاسی حالات کی تبدیلی کا براہ راست اثر صوفی عبدالرحیم کی ''مِلک ڈائری'' پر پڑنے سے جب تنگدستی کے آثار نمایاں ہو گئے تو صوفی محی الدین اور صوفی غلام محمد جو دونوں شادی شدہ تھے، انہیں روزگار کمانے کی طرف راغب کیا گیا۔صوفی محی الدین نے ملازمت کرنے سے انکار کیا۔شیخ محمد عبداللہ ریاست کے ایڈمنسٹریٹر کے بعد وزیر اعظم مقرر ہو گئے تو انہوں نے ''کشمیر ملیشیا'' کے نام سے ایک بٹالین کا تقرر عمل میں لایا۔صوفی غلام محمد کشمیر ملیشیا میں بھرتی ہو گئے۔ بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے انہیں ایک یونٹ کا کمانڈر بنایا گیا۔ان کی وردی کے شولڈر پر ایک ستارہ لگایا گیا۔کشمیر ملیشیا کے ایک یونٹ کے کمانڈر بن جانے کے بعد صوفی غلام محمد میں ایک زبرست تبدیلی ہوگئی۔وردی پہن کر جب وہ درگجن بازار سے گزرتے یا گھر سے ڈیوٹی کے لئے نکلتے تو ان کا رعب داب اوران کے چلنے کا انداز منفرد ہوتا۔اس دوران ان کے بڑے بھائی صوفی محی الدین نے اپنی ''ملک ڈائری'' کو چھوٹے پیمانے پر شروع کیا اور انہوں نے داراہارون میں ''ملک ڈائری'' کا یونٹ قائم کیا کیونکہ یہاں انہیں گوجر بستی سے وافر مقدار میں دودھ فراہم ہوتا تھا۔صوفی محی الدین کا قیام داراہارون میں رہا۔

بوچھوارہ میں رہائش گاہ کے پڑوس میں ڈپٹی کمشنر محمد رجب رہا کرتے تھے۔محمد رجب نے بخشی غلام محمد کے دورحکمرانی میں ریٹائر ہونے سے قبل صوفی غلام محمد کو ملیشیا کی ملازمت سے نکال کر ڈپٹی کمشنری میں کلرک کے عہدے پر تعینات کیا۔نبہ جی گورنر جو محمد رجب کی جگہ ڈپٹی کمشنر بنائے گئے تھے، انہوں نے صوفی غلام محمد کی قابلیت کو دیکھ کر انہیں اپنے پرسنل سیکریٹری کے سٹاف میں شامل کرلیا۔اس طرح صوفی غلام محمد جو پہلے پولیس آفیسر تھے اب سول آفیسر بن گئے ۔البتہ رعب داب وہی پہلے والا باقی رہا۔خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے دورحکمرانی میں حلقہ کمیٹیاں اور محلہ کمیٹیاں بنائیں حاجی محمد سبحان بٹ آف ڈائمنڈ موٹرس حلقہ پریذیڈنٹ اور صوفی غلام محمد محلّہ پریذیڈنٹ بن گئے تو وہ خود کو ایک حاکم سے کم نہیں سمجھتے تھے۔علاقہ درگجن میں ایک گھرانا ایسا تھا جو بدکاری کا اڈہ مانا جاتا تھا۔صوفی

غلام محمد نے اپنی سول آفیسری کو لے کر اس اڈے کو بند کرانے کا بیڑہ اٹھایا۔ البتہ جب وہ اپنے اس مقصد میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اس اڈہ کو چلانے والوں کا ''محلّہ محضر'' کرانے کا ایک آڈر جاری کیا۔ اس آڈر پر نبہ جی گورنر یعنی ڈپٹی کمشنر اور حلقہ پرزیڈنٹ محمد سبحان بٹ کے دستخط ثبت تھے۔ جب یہ آڈر اور اس پر دستخط اصلی ثابت نہیں ہوئے تو انہیں نہ صرف نوکری سے برخواست کیا گیا بلکہ انکی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔ ان کے خلاف ڈپٹی کمشنر اور حلقہ پرزیڈنٹ کے جعلی دستخط کرنے کا الزام لگا کر عدالت میں ان کا چالان پیش کیا گیا۔ یہ مقدمہ چار سال تک چلتا رہا چونکہ انہوں نے ایک نیک کام کے لئے غیر قانونی حرکت کی تھی، اس لئے معمولی سزا اور جرمانہ ادا کر کے چھوڑ دیئے گئے۔ البتہ ان کی سرکاری ملازمت پر روک لگادی گئی۔ مدتوں بیکار رہنے سے ان کے رکھ رکھا میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ مالی دشواریوں نے اُن کے لئے مشکلات پیدا کر دیں۔ چونکہ ان پر سرکاری نوکری پر پابندی لگ گئی تھی، وزیر اعظم خواجہ غلام محمد صادق نے انہیں اخبار ''خدمت'' میں ایڈیٹر نند لال واتل کے سب ایڈیٹر کے عہدے پر تعینات کیا۔ اخبار ''خدمت'' میں وہ سب ایڈیٹر سے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔ اخبار ''خدمت'' میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کے دوران ان کے اندر کا ادیب جاگ گیا۔ انہوں نے اردو اور کشمیری میں افسانے تحریر کئے۔ انہوں نے کئی شاہکار افسانے لکھ کر انہیں کتابی صورت دے دی۔

چونکہ اخبار خدمت میں ان کے اندر صحافت رچ بس گئی تھی لہٰذا انہوں نے اپنا ذاتی اخبار نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے ''سرینگر ٹائمز'' کا ٹائٹل حاصل کر لیا۔ صوفی غلام محمد کا ''سرینگر ٹائمز'' صحافتی دنیا کا ایک ستارہ بن گیا۔

☆......جان محمد آزاد

صوفی غلام محمد۔۔۔ایک دبستانِ صحافت

وادیٔ کشمیر میں صحیفہ نگاری کی ابتدا پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی، شمیم احمد شمیم اور اللہ رکھا ساغؔر جیسے بعض نبض شناس قلم کاروں کے ذریعہ ہوئی جن کی بے باک تحریروں سے 1960ء کے آس پاس یہاں صحافت کے ایک نئے دوّر کا آغاز ہوا۔ جن نڈر اور دیانت دار صحافیوں نے اِس دوّر میں نئی اصطلاحیں اختراع کر کے اخبار کو تجریدیت Abstract Trends کی علامت بنا کر پیش کیا اُن میں صوفی غلام محمد ایک نہایت اہم نام ہے۔

صوفی غلام محمد اپنے لڑکپن کے زمانے ہی سے استحصال کے شکار لوگوں کے حق میں علم بغاوت بلند کرتے رہے۔ انہیں مقامی طور بعض ممتاز قلم کاروں کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا جن میں علی محمد لون، قیصر قلندر اور پران کشور ایسے فن کار شامل تھے۔ آپ کرشن چندر، فیض احمد فیض، منشی پریم چند اور سعادت حسن منٹو کے فن سے بے حد متاثر تھے۔ آپ ریڈیو کشمیر سری نگر سے بھی وابستہ رہے اور اُس کے لئے فیچر بھی تحریر کرتے رہے۔ ''شمع'' ہندوستان کا ایک ممتاز ماہنامہ تھا جس میں 1962ء کے دوران آپ کا افسانہ ''گنجا'' شایع ہوا۔ اِس افسانے میں ایک کشمیری کاریگر کی ہُنر مندی اور اقتصادی بدحالی کا دلچسپ معرکہ پیش کیا گیا تھا۔

''سری نگر ٹائمز'' 1969ء میں ایک ہفت روزہ کی صورت میں سری نگر سے شایع

ہوا۔ زبان و بیان کی نفاست نے پھر 1970ء میں اِسے ہفت روزہ سے روزنامہ بنا دیا۔ صوفی غلام محمد کی طرزِ تحریر نے اِس اخبار کو ایک رجحان ساز روزنامہ بنا کر پیش کیا۔ آپ کے اندازِ بیان میں جہاں حقایق کا دوٹوک اور صحافیانہ انداز صاف جھلکتا تھا وہاں اِس کے ساتھ ساتھ اِس میں حقایق کے پسِ پردہ افسانوں کا احوال بھی بیان کیا جاتا تھا۔ آپ نے روایت سے انحراف کر کے اپنی تحریروں میں جدت پیدا کی۔

آپ کے بیشتر معاصرین اُس زمانے میں سیاسیات کے رجحانات پر کچھ تحریر کرنے سے احتراز کرتے تھے لیکن صوفی صاحب نے نہایت جرأت مندی سے سامنے آ کر اسے ایک Mission بنایا اور مفاد پرست سیاسی رہنماؤں کے خلاف آگے آ کر صحافتی رجحانات کے ایک نئے دبستاں کے ابواب کھول دیئے۔

صوفی غلام محمد، محض ایک صحافی نہیں تھے بلکہ اِن کے ہاتھوں میں گویا پارس پتھر کی خوبی تھی اور اس پارس کے چھونے سے روایتی سرکاری اطلاعات بھی سونے کا روپ دھارن کرتی تھیں چنانچہ آپ کی شگفتہ اور تیکھی تحریر اِس بے رنگ بیان کو بھی ایک ایسا انداز بخشتی تھی کہ مطالعہ کرنے والا دبستانِ صحافت کی ایک الف لیلوی دنیا میں پہنچ جاتا!

اِن برجستہ تحریروں سے میڈیوکیرٹی کے مصاحبین کی نقابیں تار تار ہوا کرتی تھیں اور روزنامہ ''سری نگر ٹائمز'' وادی کشمیر کے اطراف میں Investigative Journalism کی ایک نئی علامت بن گیا۔ بعد کے برسوں میں کمپیوٹر اور سیٹلائیٹ مواصلات سے مستفید ہونے کے بعد صوفی صاحب نے خبر و نظر کی ترسیل و تشہیر میں ایک نئی برق رفتاری لائی جس سے اُن کے روزنامے کی Circulation میں بے پناہ اضافہ ہوا۔۔۔!

اِن نئے ادوار میں بھی صوفی غلام محمد ذوق و شوق اور عرق ریزی سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ وہ روزنامہ سری نگر ٹائمز کے لئے رپورٹنگ بھی کرتے تھے۔ فیچر نگار، سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، رپورٹر، فیچر رائیٹر، خصوصی نامہ نگار، سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، کالم

نویس اور پھر ایڈیٹر! آپ کے فرائض اتنے نو بہ نو اور ہزار رنگ ہوا کرتے تھے جتنا کہ خود یہ عالم رنگ و بو۔ آپ کسی بھی موضوع پر بے تکان لکھ سکتے تھے۔ مختلف ملکی و بین الاقوامی حالات پر اپنی آرا کا اظہار اپنے مخصوص انداز میں کرتے تھے۔ پھر کارٹون صحافت کے نئے ابواب نے ''سری نگر ٹائمز'' کو نہایت قلیل وقت میں وادیٔ کشمیر کا مقبول روزنامہ بنا دیا۔ صوفی صاحب بلا خوف و خطر ایک بے رحم جراح کی طرح معاشرے کے مریض جسم پر اپنے قلم سے نشتر چلاتے رہے۔ آپ کی شگفتہ تحریر کے خستہ رنگ ''شرارے'' کے کالم سے بہ خوبی عیاں ہوتے ہیں۔ آپ یہ کالم لگ بھگ ایک چوتھائی صدی تک مسلسل تحریر کرتے رہے۔ اِس کالم کی شوخ و شنگ اور خستہ خستہ crisp تحریریں بلاشبہ مطالعہ کی چیزیں ہوا کرتی تھیں!

ایک منفرد اور مقبول صحافی کے علاوہ آپ ایک اچھے محقق بھی تھے۔ اپنی حیات کے آخری ایام میں بھی آپ یہ قلمی جہاد لڑتے رہے۔ چنانچہ آپ کی کتاب ''گم نام وادی، برگشتہ لوگ'' اشاعت کے آخری مراحل میں تھی۔ اپنی اِس سوانحی حیات کے ہر موڑ پر آپ نے کشمیر کی سیاسی تاریخ کے واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔ آپ نے ایک سچے مورخ کی طرح نہ کسی سیاسی مکتب فکر کی مخالفت کی ہے اور نہ بے جا حمایت۔ آپ کا انداز کھرا اور دوٹوک ہے! لیکن آپ کی یہ کتاب آپ کی حیات میں سامنے نہیں آسکی تاہم آپ کی ساری توجیہات ساری کاوشیں اور ساری ریاضتیں اپنے محبوب روزنامے ''سری نگر ٹائمز'' کو سجانے سنوارنے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ چنانچہ داعی اجل کو لبیک کہنے کے چند دن پہلے تک بھی آپ اخبار کا اداریہ تحریر کرتے رہے!

☆☆☆

☆......محمد نذیر فدا

صوفی غلام محمد - ایک اچھے صحافی

درمیانہ قد کا ایک شخص، چہرے پر مسکراہٹ، سر پر لمبے اور بکھرے بکھرے بال، سفید بوشارٹ اور سیاہ رنگ کی پتلون پہنے ہوئے۔ بھوئیں چوڑی اور سیاہ۔ ریش تراشیدہ لیکن مونچھیں تھوڑی چوڑی۔ یہ کون ہوسکتا ہے جو دوردرشن سرینگر کے NewsRoom سے گزرے اور مجھ سے ملے۔ ہاں میں اُن دِنوں دوردرشن کے شعبۂ خبر سے منسلک تھا۔ اُن سے بات ہوئی تو وہ دوردرشن کے ایک مقبول پروگرام "حالاتِ حاضرہ" کی ریکارڈنگ کرنے ٹی وی سینٹر سرینگر تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں افغانستان میں روسی انخلاء کی خبریں زوروں پر تھیں لہٰذا صوفی مرحوم نے اپنے نکتہ نظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسی عنوان کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مرحوم صوفی غلام محمد "سرینگر ٹائمز" نے اپنا سفر ایک صحافی کی حیثیت سے شروع کیا۔ صوفی صاحب نے ابتدائی دور میں اپنی خدمات اخبار "خدمت" کے ساتھ وابستہ کیں۔ اُن دِنوں اخبار "خدمت" کے مدیرِ اعلیٰ سورگیہ نندلعل واتل تھے۔ چوں کہ یہ اخبار کانگریس پارٹی کا ترجمان تھا اور ریاست میں اس کو ایک خاص پذیرائی حاصل تھی، لیکن صوفی مرحوم نے اس اخبار کو اس جھمیلے سے نکال کر ایک نئی جدّت عطا کی اور اس کو نکھارنے اور سنوارنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارٹی کے محدود دائرے سے نکال کر یہ اخبار عوامی اخبار کی شکل میں اُبھرا۔ اس طرح عام قارئین یہ اندازہ نہ کر سکے کہ یہ اخبار کسی پارٹی کا ترجمان ہے۔ اصل میں صوفی صاحب ادبی ماحول سے آکر صحافت میں شامل ہوئے۔ اس لئے اُن کی تحریر میں سیاسی تجزیہ نگاری کی چھاپ

موجود تھی۔اس طرح صوفی صاحب کی کوششوں کی بدولت اخبار ''خدمت'' پر ادبی رنگ چھا گیا اور یہاں کے ادبی حلقوں میں توجہ کا مرکز بنا۔اُن دنوں ادیب، قلمکار اور شاعروں کے لئے میدان بہت تنگ تھا لیکن مرحوم صوفی صاحب کی کاوشوں کی بدولت اخبار ''خدمت'' کے ذریعے اپنی نگارشات وہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔صوفی صاحب مرحوم نے اخبار ''خدمت'' میں دو کالم متعارف کئے جن میں ''جنتا کی آواز'' اور ''سجرے'' بہت مشہور ہو گئے۔صوفی صاحب نے ان دو کالموں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی۔ ''سجرے'' کالم میں انہوں نے بے باک اور بے لاگ تبصرے شائع کئے۔صرف یہی نہیں بلکہ صوفی صاحب نے ادبی میدان میں بھی انقلاب لایا۔انہوں نے کشمیری زبان میں طرحی مشاعروں کا اہتمام کیا جن میں ریاست کے اطراف واکناف سے شعراءتشریف لاتے تھے۔

اخبار ''خدمت'' میں اپنی تیکھی اور غیر جانبدارانہ تحریروں کی بدولت کانگریس پارٹی کی لیڈر شپ اور ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوئے اور انہوں نے صوفی صاحب سے دوٹوک الفاظ میں کہا یا تو آپ ہماری پیروی کریں یا اخبار ''خدمت'' چھوڑ دو۔صوفی مرحوم نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور اخبار ''خدمت'' کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا۔صوفی صاحب کا یہ فیصلہ ان کے لئے تکلیف دہ تھا کیونکہ یہ اخبار ان کی روزی روٹی کا مسئلہ تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست میں خواجہ غلام محمد صادق کے سب سے بڑے حریف سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد مرحوم نے اپنا اخبار ''نوائے کشمیر'' کے نام سے اجراء کیا اور صوفی صاحب کو یہ اخبار جاری کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔مرحوم نے ایک سال تک ''نوائے کشمیر'' میں کام کیا اور ان کو اندازہ ہوا کہ اس اخبار میں بھی وہ اپنی بات کا اظہار نہیں کر سکتے اور کوئی علاحدہ اخبار جاری کرنے کا من بنایا۔

ریاست میں اردو صحافت کی ایک قدیم تاریخ ہے۔بعض تذکرہ نگار ''بدیا بلاس'' کو ریاست کا پہلا اخبار قرار دیتے ہیں اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ محمد دین فوقؔ نے صحافت کے میدان میں اپنا ''کارواں'' لاہور کے تاریخی شہر سے شروع کیا اور اس زمانے

میں کئی اخبارات شائع کر کے ریاست میں صحافت کا باضابطہ آغاز کیا۔لیکن لالہ ملک راج صراف نے اپنی کتاب Fifty years as Journalist میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ریاست میں انہوں نے ہی سب سے پہلا موقر جریدہ ''رنبیر'' کے نام سے سال 1924ء میں جاری کیا۔مگر مرحوم رشید تاثیر نے ''تحفۂ کشمیر'' نامی اخبار کو ریاست کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔ریاست میں پہلے سے ہی صحافت کا میدان پُر خار نظر آتا ہے اور اِس پیشے سے وابستہ ہونا کسی آزمائش سے کم نہیں۔اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں، اس میں کافی سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس میں دفتر، ملازمین، نامہ نگار، ترسیل، طباعت، تقسیم کاری، کاتب اور چھاپ خانے وغیرہ کچھ ایسی چیزیں درکار ہیں جن پر کافی خرچہ آتا ہے۔ اس صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے کم و بیش ہی کوئی صحافی ذاتی طور اپنا اخبار جاری کرنے میں کامیاب ہوا۔

ریاست میں وقتاً فوقتاً بہت سارے اخبارات جاری ہوئے۔لیکن ان میں اکثر اخبارات یا تو حکومتِ وقت کا راگ الاپتے یا ذاتی مفادات کی خاطر اقتصادی اور مالی مراعات حاصل کرنے میں پیش پیش رہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ اخبارات بعد میں اپنی موت خود مر گئے۔لیکن ایسے اخبارات اور رسائل کی بھی کافی تعداد موجود ہے جنہوں نے حکومت وقت کے ساتھ ٹکر لی اور بعد میں انتقامی کاروائی کے نتیجہ میں ان کی ڈکلریشن منسوخ کی گئی یا چھاپ خانوں شبانہ چھاپہ ڈال کران کو سربمہر کر دیا گیا۔

صوفی صاحب صحافت کے اس پُر خطر میدان میں کود کر زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوئے۔انہوں نے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ زمانے کی تند ہواؤں کا مقابلہ کیا۔مالی دشواریوں کے باوجود ہار نہ مانی اور اپنا موقر اخبار ''سرینگر ٹائمز'' 16/ جون 1969ء کو جاری کرنے میں کامیاب ہوئے اور اگست 1969ء میں اسکو روزنامے میں تبدیل کیا۔کارٹون کی بدولت یہ اخبار بامِ عروج تک پہنچا اور عوام میں بہت مقبول ہوا۔ ایک وقت آیا جب ریاست میں دو ہی اخبار یعنی ''سرینگر ٹائمز'' اور ''آفتاب'' کثیر

الاشاعت ہونے کی وجہ سے صف اوّل میں شمار ہونے لگے۔ ''سرینگر ٹائمز'' کے مقبول ہونے میں ان کے برادرِ اصغر بشیر احمد بشیر کا بھی رول شامل رہا جنہوں نے کارٹونوں کے ذریعہ بہت کچھ کہا جو تحریر سے زیادہ پُرکشش اور موثر ثابت ہوا۔

مرحوم شمیم احمد شمیم جو مدیر ''آئینہ'' تھے، صحافت کے میدان کے شاہ سوار تھے۔ لیکن صوفی صاحب کے ساتھ ان کی صحافتی چپقلش زوروں پر تھی۔ اس کے باوجود صوفی صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب 1980ء میں شمیم صاحب کا انتقال ہوا تو صوفی صاحب نے ان کا شایانِ شان تعزیت نامہ تحریر کیا کہ سب قارئین حیران رہ گئے۔

صوفی صاحب نے شمیم مرحوم کو سنہرے الفاظ میں خراج عقیدت کیا۔ اپنے اخبار کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت لکھی کہ آج ان کے انتقال سے صحافت بے نوا ہوگئی۔ دراصل یہ صوفی مرحوم کا خلوص تھا جو انہوں نے اپنے اس ہم پیشہ دوست کے لئے ادا کیا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

☆☆☆
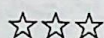
☆......ذی شان فاضل

صوفی غلام محمد- قلم کا شاہ سوار

1960ء کی دہائی میں جب ہم ریاست کی صحافت پر نظر دوڑاتے ہیں تو چند معتبر اخبارات، رسائل اور صحافی ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

خدمت، ہمدرد، آفتاب، روشنی، آئینہ، سری نگر ٹائمز، اقبال چند ایسے اخبارات کے نام ہیں جو عوام تک روزمرہ کی اطلاعات، حالات و واقعات پہنچانے میں پیش پیش رہے۔ مرحوم غلام محمد صادق نے جب ریاست جموں و کشمیر میں بحیثیت چیف منسٹر باگ ڈور سنبھالی تو وہ کشمیری زبان وادب کی ترویج کے لئے بھی کچھ مثبت کام کرنے کے خواہاں تھے۔ ایک تو انہوں نے بمبئی کی ایک فلم کمپنی ''برگِ چنار'' کے ذریعہ شاعر مہجور پر ایک فلم بنوائی دوسرا ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام تھا فیلڈ سروے آرگنائیزیشن۔ یہ ادارہ جانکی ناتھ زتشی، میر غلام رسول نازکی، فاضل کاشمیری، اختر محی الدین اور چند زعما پر مشتمل تھا۔ یہاں سے صادق صاحب کی ہدایت پر ایک کشمیری اخبار ''چمن'' کے نام سے نکلتا تھا جس کے لئے جگن ناتھ خیری، علی محمد لون، منظور فاضلی، اختر محی الدین، فدا محمد حسنین اور کئی دیگر سرکردہ ادیبوں کے شاہ پارے چھپا کرتے تھے۔ یہ اخبار ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا اور ہفتہ وار چھپا کرتا تھا۔

صوفی غلام محمد صحافت کے میدان میں اخبار ''خدمت'' کی وساطت سے آئے۔ وہ کئی برسوں تک ایڈیٹر نندلال واتل کی سربراہی میں روزنامہ ''خدمت'' کے لئے کام کرتے تھے

اور اپنے رہبر نند لال واتل سے صحافت کے نشیب و فراز سے واقف ہوتے رہے۔ سال 1969ء میں صوفی صاحب نے ''سری نگر ٹائمز'' کے نام سے ایک نیا اخبار شروع کیا جس میں اُن کے بھائی صوفی غلام محی الدین اور بشیر احمد بشیر پیش پیش رہے۔ اس اخبار کی سب سے نئی اور انوکھی بات اس کا روزمرہ چھپنے والا کارٹون تھا۔ اس کے خالق بشیر احمد بشیر تھے جو تا حال اخبار کی مقبولیت کا باعث ہے۔ یہ کارٹون بنا الفاظ کے لوگوں کے مسائل کی ترجمانی کرتا چلا آرہا ہے۔ صوفی صاحب اخبار کی ادارت کے علاوہ ایڈیٹوریل بھی لکھا کرتے تھے۔ اخبار چھاپنا اُس وقت جان فشانی کا کام تھا اور اسے حرف بہ حرف تحریر کرنا ایڈیٹر کا فرضِ اولین مانا جاتا تھا۔ آفسیٹ کا ابھی نام ونشان نہیں تھا۔ لتھو پرنٹنگ عام تھی اور دس پیسے میں اخبار بکا کرتا تھا۔

صوفی غلام محمد صحافت کے میدان میں ایک منفرد نظریئے کے قائل تھے اور یہی نظریہ اُن کے اخبار کی پالیسی تھی جس کے لئے انہیں کئی مرتبہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اُن کی جان پر بھی حملہ ہوا۔ لیکن وہ ہمت واستقلال کے ساتھ اپنے فرضِ منصبی پر قائم رہے اور قلم کے ذریعہ عوام کے خیالات، جذبات اور مشکلات کی ترجمانی کرتے رہے۔

صوفی غلام محمد ایک اعلیٰ پایہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد ادیب بھی تھے۔ کہانیاں تحریر کرنے میں اُن کا ایک الگ اور منفرد انداز تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کہانیاں تحریر کرنے میں وہ ایک روایتی انداز کے قائل تھے۔

''ژِنہِ ژوٗر'' (کوئلہ چور) صوفی صاحب کی ایک اچھوتی تحریر ہے جس نے اِس ادیب کو ادبی میدان میں ایک شناخت بخشی۔ ''عجب ملک تہ نوش لب''، ''مال دید'' دو اور شہکار ہیں۔ اُن کی تحریر کردہ کہانیوں پر مبنی کتاب ''لوٗسۍ متۍ تاریکھ'' کشمیری زبان وادب میں ایک سرمایہ سے کم نہیں ہے۔

صوفی غلام محمد کو کشمیری، اُردو اور انگریزی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے آپ ایک قانون دان کی طرح غور وفکر میں مشغول رہتے تھے۔

طبیعت انتہائی سادہ، گفتار میں نرمی اور چال وچلن میں انداز صوفی صاحب کی

شناخت تھی۔ شروع کے اوائل میں دیر رات گئے تک ''سری نگر ٹائمز'' کے آفس (بڈشاہ چوک) میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کیا کرتے تھے اور چلہ کلاں کی یخ بستہ راتوں میں اپنے گھر درگجن پیدیل سفر کیا کرتے تھے۔

1935ء میں پیدائے ہوئے صوفی غلام محمد کی صحافتی اور زندگی کا سفر کئی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک درخشان مقام پر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قارئین کے ذہن منور کرنے میں آج پیش پیش ہے۔

تنقیدی اعتبار سے جب ہم مرحوم صوفی غلام محمد کے ادبی شہہ پاروں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ موضوع سے کہیں زیادہ کردار اُن کے لئے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ کردار کی زندگی، اُس کے دُکھ سُکھ کے ہمراہ خود سے وابستہ کرتے ہوئے اس کی داستان اپنے قلم کے زور سے کاغذ پر بکھیر دیتے ہیں اور الفاظ کو اُس کردار کی زبان اور اُس کو محسوس ہونے والا کرب بخش دیتے ہیں۔ یہ کردار سماج میں اپنی آواز بند کر کے اپنے حالِ زار کو بیان کرتا ہے اور اپنے لئے انصاف طلب کرتا ہے۔ کشمیری ادب کا مطالعہ کرتے وقت کراداروں کے ساتھ ہم آہنگی کے فن میں اسی طرح کی مہارت ہمیں مرحوم اختر محی الدین اور علی محمد لون کے شہ پاروں میں بھی ملتی ہے۔ یہ کہنا مناسب نہیں کہ کس ادیب نے کس کا اثر قبول کیا لیکن مجموعی اعتبار سے ان ادیبوں نے ایک عام کشمیری اور اُس کی حالت زار پر جس طرح قلم اٹھایا ہے وہ اُس دور کے کشمیری اور اس کے ماحول کو ہمارے سامنے آشکارہ کر دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہمارے اسلاف کس طرح کی زندگی گزارتے تھے۔

یہ صحافتی آسمان پر چمکنے والے ستارے مرحوم جی آر عارف، خواجہ ثناء اللہ بٹ، نند لال واتل، مکھن لعل محو، شمیم احمد شمیم، میر غلام رسول نازکی، فاضل کاشمیری، غلام نبی خیالؔ، بشیر احمد بشیر اور کئی دوسرے صحافی ہر دور میں اپنی چمک سے نسل در نسل ہر دھندلے راستے کو اپنی روشنی سے مُنور کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

☆......ش۔م۔احمد

صوفی غلام محمد۔
ایک صاحبِ عزیمت ممتاز اردو صحافی

ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ کا ایک اہم ترین کردار صوفی غلام محمد ہیں۔ ان کی قد آور شخصیت اور صحافتی خدمات اس تاریخ کا ایک قابل قدر باب قرار دیا جاسکتا ہے۔صوفی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 1956ء میں روزنامہ ''خدمت'' کے نائب مدیر کی حیثیت سے کیا۔''خدمت'' میں اُنہیں نندلال واتل جیسے کہنہ مشق اردو صحافی کا تلمذ حاصل رہا مگر یہاں انتظامیہ سے اختلافات اور معاصرانہ چشمک کے پیش نظر انہیں ''خدمت'' سے برطرف کیا گیا۔اس کے بعد 1967ء میں بخشی غلام محمد کے ہفت روزہ ''نوائے کشمیر'' کی ادارت سنبھالی۔یہ اخبار صوفی صاحب کے دورِ ادارت ہی میں روزنامہ بنا لیکن ان کے اندر کا صحافی یہاں بھی تشفی سے تہی دامن رہا۔اس لئے انہوں نے صحافت کی فضائے بسیط میں اپنی اڑان بھرنے کے لئے اپنا نجی اخبار جاری کرنے کا تہیہ کیا۔اس کے لئے موصوف نے 1966ء میں باضابطہ طور ڈیکلریشن کی درخواست دی۔تین سال تک وہ اس دن کے انتظار میں مسلسل پیچ وتاب میں رہے کہ کب ''سری نگر ٹائمز'' کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔دفتری طوالت، سیاسی اڑچنیں اور قانونی پیچ وخم کی مسافتیں طے کرنے کے بعد ان کی محنت رنگ لائی۔صوفی صاحب کے من کی مراد پوری ہوئی تو انہوں نے ہفت روزہ ''سری

نگرٹائمز'' (سنہ اجرا18 جون1969ء) جاری کیا۔ ''سری نگرٹائمز'' صرف ڈیڑھ ماہ کے قلیل
عرصہ بعد روزنامہ بن کر ریاست میں صحافت کے اُفق پر پورے آب وتاب سے جگمگا اُٹھا۔
1970ء کے اوائل میں وادیٔ کشمیر میں جابجا آگ زنیوں کی پُر اسرار وارداتیں رونما
ہوئیں۔لوگ انگشت بدنداں تھے کہ یہ کیا ہورہا ہے کہ ان کے جان ومال کے لالے پڑے۔
موقع کی مناسبت سے ''سری نگرٹائمز'' نے ریاستی حکومت کی اس بابت کڑی نکتہ چینی کرنے
میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ وہ حالات کو سنبھالا دینے اور عوام کے تئیں اپنی ذمہ داریاں نبھانے
میں ناکام رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ مدیر موصوف کو شاباشی ملتی،اس صاف گوئی کی پاداش
میں ''سری نگرٹائمز'' پر دوماہ طویل پابندی عائد کی گئی۔اتنا ہی نہیں بلکہ سنہ 71ء میں جب
صادق حکومت نے ایمرجینسی پراویجنز آرڈی ننس کا مسودۂ قانون ایوان میں لایا تو صوفی
صاحب نے اسے پریس کی آزادی پر کاری ضرب قرار دینے میں کوئی پس وپیش نہ کیا۔اس
طرح انہوں نے ایک طرف آزادیٔ اظہار کے لئے خامہ فرسائیاں جاری رکھیں اور دوسری
طرف زمانے کے تقاضوں پر لبیک کہہ کر 1978ء میں ''سری نگرٹائمز'' کی طباعت کو معیاری
بنانے کے لئے آفسٹ پرنٹنگ کو اخبار میں متعارف کرایا۔صوفی صاحب کا اپنے آفسٹ
پریس کی رسمِ افتتاح مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں کرانا اس بات کا غماز ہے کہ ''سری نگرٹائمز''
کے مدیر اعلیٰ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے۔آج یہ اخبار اپنی اشاعت کے
چھیالیسویں برس میں داخل ہوچکا ہے اور صوفی صاحب بھی کب کے دنیائے فانی سے
رخصت ہو چکے ہیں مگر اخبار اپنی اوّلین خصوصیات اور نقش ونگار کے ساتھ محوِ سفر ہے، اگرچہ
اس میں جدتیں لانے کی بہت گنجائش موجود ہے۔اپنے اس طویل سفر میں ''سری نگرٹائمز'' نے
زمانے کے سرد وگرم ہی نہ دیکھے،تاریخ کے اُتار چڑھاؤ کا مشاہدہ ہی نہ کیا،خبروں، تجزیوں،
کارٹونوں، مضامین، فکاہیات اور دوسرے کالموں کے انبار ہی جمع نہ کئے بلکہ ایک روایت
شکن مگر شاندار وصحت مند تاریخِ مقاومت بھی ترتیب دی۔ ''سری نگرٹائمز'' کی اس ساری
صحافتی کدوکاوش پر ایک اُچٹتی نظر ڈالئے تو صوفی غلام محمد اور ان کے برادر اصغر بے بدل

کارٹون نویس بشیر احمد بشیر کی شخصیات اور طبائع کی پرچھائیاں قدم قدم پراس میں رقصاں نظر آتی ہیں۔ صوفی خانوادے کا یہ ایک طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں صحافتی حس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ اسی کا فیضان ہے کہ ''سری نگر ٹائمز'' کے ساتھ مرحوم صوفی محی الدین (سابق مدیر ''شہمیر'') سے لے کر اس گھرانے کے صوفی محمد یوسف، صوفی شاداب بشیر اور صوفی ساحل یوسف اخبار سے منسلک ہیں جب کہ بشیر احمد بشیر اس اخبار کے روح رواں ہیں۔

صوفی غلام محمد نے جو زمانہ پایا وہ سیاسی اعتبار سے کافی نازک رہا۔ اس نوع کے صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات میں اکثر اوقات کسی صحافی کا وقت کی مقتدر قوتوں کے دباؤ میں آنا قابلِ فہم ہے مگر صوفی غلام محمد چونکہ معتبر صحافی ہونے کے ساتھ طبعاً ایک جری اور راست گو قلم کار بھی تھے، اس لئے انہوں نے اپنے اخبار کی کبھی وضع بدلی نہ اپنی خو چھوڑی۔ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں کسی طرح کی مصلحت کوشی کو آڑے نہ آنے دیا۔ یہ صورت حال کسی صحافی، ادیب اور دانش ور کے لئے سہل اور آسان نہیں ہوتی بلکہ عزیمت کا یہ راستہ اختیار کرنے والے کو جب تک لوہے کے چنے چبانا نہیں آتے، اس وقت تک اس کی غیر جانب داری اور پیشہ ورانہ امانت داری کا امتحان ادھورا ہی رہتا ہے۔ صوفی صاحب کا صحافتی کیریر اس لحاظ سے کافی متاثر کن رہا اور انہوں نے یہ امتحان بہت ہی عمدگی کے ساتھ دیا۔ اس پس منظر یہ چند ایک مثالیں ہمارے لئے چشم کشا ثابت ہوں گی۔ انتخابات کے ایک موقع پر ''سری نگر ٹائمز'' کی آزادانہ وغیر جانب دارانہ پالیسی کے ردعمل میں ریاستی حکومت کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر کے دو کارٹونوں پر بہت برافروختہ ہوئی اور اسی تناظر میں ڈپٹی کمشنر سری نگر نے مدیر اخبار کو اپنے یہاں طلبی کا نوٹس جاری کر دیا۔ صوفی صاحب نے اس نوٹس کے حوالے سے سیدھے طور ریاستی ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ عدالت نے مداخلت کی اور ڈی سی سری نگر پر دو ہزار روپے کا جرمانہ عائد کیا۔ بعینہٖ مابعد ۷۵ء صوفی صاحب کو اپنے سیاسی نظریات کے دفاع کا بہت خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لال چوک سری نگر کے قلب میں واقع ہوٹل تاج میں ''سری نگر ٹائمز'' کا دفتر انہیں وقت کے صاحبانِ اقتدار کی ناراضی کے سبب بلا کسی توقف کے 1976ء

میں خالی کرنا پڑا کیونکہ مدیر اعلیٰ ''سری نگر ٹائمز'' ان کے سیاسی موقف سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ ان دنوں صوفی صاحب کی تنگ دستی کا حال یہ تھا کہ انہیں قطعی یقین نہ تھا کہ آیا اخبار کا تسلسل قائم بھی رہ پائے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اخبار کے لئے اشتہارات کی غیر تحریری بندش بھی رہی مگر صوفی غلام محمد ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ محض جرأت اظہار کے بل پر صبر و استقلال سے کرتے رہے۔ اس سے بڑھ کر یہ واقعہ ''سری نگر ٹائمز'' کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ بشیر احمد بشیر نے ایک کارٹون میں اسمبلی ممبران کی شبیہہ اپنی ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں ایسی بنائی تھی کہ وقت کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے اسمبلی میں ان کے خلاف مراعات شکنی کی تحریک پیش کی۔ ایوان کے اسپیکر نے صوفی صاحب اور بشیر صاحب کو اس ''جرم'' میں اسمبلی میں بلا کر اپنی صفائی دینے کے لئے بُلایا۔ یہ دونوں اسمبلی میں بہ نفیس نفیس آئے اور کارٹون کی مدافعت میں وہ نکتے بیان کئے کہ خود شیخ محمد عبداللہ کے لئے اپنی تحریک واپس لئے بغیر چارہ نہ رہا ۔ ریاست میں جب خواجہ غلام محمد شاہ نے عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو ''سری نگر ٹائمز'' نے اپنی طبیعت کے عین مطابق حکومت کی بعض پالیسیوں پر تنقید کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اخبار کے لئے سرکاری اشتہارات میں کمی آگئی۔ یہی مقدمہ لے کر صوفی صاحب نے پھر ایک بار عدلیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر عدالتِ عالیہ کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی حکومت نے اخبار کے حق میں اشتہارات کی کمی کا گلہ دور کر کے اپنی پنڈ چھڑائی۔ اس کے بعد جب 1990ء میں ریاست بالخصوص کشمیر میں حالات کی نامساعدت کا آغاز ہوا تو دیگر اخبارات کے ساتھ ساتھ ''سری نگر ٹائمز'' پر بھی صورت حال کے اثرات مرتب ہوئے۔ صوفی صاحب نے اس موقع پر بھی اپنے اصولوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کئے بغیر بڑی حد تک اپنی صحافیانہ ذمہ داریوں سے انصاف کرنے کی جست لگائی۔ حتیٰ کہ لال چوک سری نگر میں ''سری نگر ٹائمز'' کا دفتر نذرِ آتش کیا گیا کہ صوفی صاحب کو بچھوارہ ڈلگیٹ کے گھر میں ہی اخبار کا دفتر سجانا پڑا۔ ان پر ایک موقع پر جان لیوا حملہ بھی ہوا جس میں وہ بال بال بچ گئے مگر پھر بھی موصوف نے اپنی آزاد خیالی پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔

☆☆☆
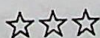
☆......زاہد مختار

صوفی غلام محمد: آئینہ ساز افسانہ نویس

ایک معروف دانشور پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں: ''کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے۔ کہانی انسان کے اُن کارناموں کی روداد ہے جس میں اُس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی۔ کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور تخیل، تصور اور رومان کے ایک جہانِ تازہ کی ایک تصویر ہے۔''

اس مختصر اور جامع تناظر میں اگر ہم صوفی غلام محمد کے کچھ افسانوں بالخصوص اُن کے افسانوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں وقار عظیم کے کچھ نکتوں کے اردگرد گھومتا ہوا، پھیلتا ہوا ایک بڑا سا دائرہ نظر آنے لگتا ہے۔ ایک ایسا دائرہ جو ایک مخصوص طرزِ تحریر لے کر سامنے آتا ہے۔ صوفی غلام محمد کی افسانہ نگاری، اُس کا ایک جنون تھا یا ایک مشغلہ، ایک شوق تھا یا اور کچھ یہ بات واضح ہے اُن کی افسانوی تحریروں میں، اُن کی کہانیوں میں وہ انسان کو فتح مند ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر قلم کار کا خواب کردار کی جبلت وفطرت کے آگے چکنا چور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کرداروں کو تکتا رہ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو اُن کرداروں میں متصادم قوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ترغیب بدرجۂ اُتم موجود رہتی ہے جس کی عمدہ مثال

اُن کا افسانہ ''ژنہ ژور'' (کوئلہ چور) ہے۔ اس افسانے میں پُر اثر اور بہت ہی خوبصورت انداز میں ایک کردار محمدو کے ذریعے دو مظلوم ملازموں کو ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی ترغیب دیتا ہے لیکن وہ اپنی بے بسی کے حصار سے باہر آنے کی خواہش کے باوجود مصلحت آمیزی کی تصویر بن جاتے ہیں.... اس دوران کئی جگہوں پہ ایک کردار کے ذریعے کہانی کار نے اپنے احتجاج کی تپش کو در پردہ ہوا دینے کی سعی کی۔ کسی کو کسی کے ذریعے احساس دلانے کی سعی کی ہے اور وہ اس کوشش میں غنی اور عبداللہ کی بزدلی کے باوجود کامیاب بھی ہیں کہ حال کا ہلکا سا احساس بھی کبھی کبھار مستقبل کا ایک انقلاب ثابت ہوتا ہے۔ اس افسانے کی کہانی ایک کشمیری نان بائی کی دکان کے اندر جنم لیتی ہے لیکن اس کا انجام اُس دکان سے باہر آتا ہے ایک احتجاج بن کر.... دیکھا جائے تو موضوع میں کوئی خاص ڈرامائی عنصر شامل نہیں لیکن خوبصورت منظر کشی اور بیانیہ قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ گہرائی میں جو بات دامنِ احساس کو چھو کے گزر جاتی ہے اُس کی داستان محمدو کے اپنی نوکری سے برخاست ہونے اور اُس کے بزدلوں کی جانب پھینکے گئے آخری لفظ ''کوئلہ چور'' میں چھپی بزدل شیر کی کہانی، ایک وسیع تخیل کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

صوفی صاحب کے افسانے مجموعی طور پہ اور روایتی انداز میں کسی چونکا دینے والے کلائمکس کا منظر سامنے نہیں لاتے لیکن اُن کے ہر افسانے کا انجام ایک نئی کہانی کا آغاز لگتا ہے۔ اُنہوں نے بیشتر افسانوں کے عنوان اپنے اُن کرداروں کے نام پہ رکھے ہیں جن کو وہ آئے دن اپنے اردگرد کے ماحول میں دیکھا کرتے تھے، اُن کو اپنی طائرانہ نگاہ سے جانچا کرتے تھے اور اُن کی حرکات و سکنات، مہمات و حالات سے کوئی کہانی کشید کرتے تھے۔ موثر بیانیہ سے قاری اُن کے سحر کا اسیر ہو ہی جاتا ہے اور وہ بظاہر اُن عام کرداروں کی ایک جانی پہچانی دنیا کے طلسم میں کھو کے زندگی کی کڑواہٹ یا مٹھاس اپنے رگ و پے میں محسوس کرتا ہے۔ ایسا ہی اُن کا ایک کردار ہے ''مال دید'' بظاہر ایک ساگ بیچنے والی عورت ہے لیکن خود میں ایک ولولہ، ایک جوش، ایک انقلاب، ایک جنون، ایک انتھک جدوجہد ہے

جو مردوں کی دنیا میں اپنے کردار پر کوئی بھی آنچ نہ آنے دینے کا عزم کیئے ہوئے سرخرو ہو جاتی ہے کہ کہانی کا یہ کردار جاوداں ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک عورت کی یہ ستم ظریفی آج بھی مختلف انداز سے سامنے آتی ہے لیکن مال دید کا کردار آج بھی بہت سارے چہروں کے پسِ پردہ نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں کشمیر کے متضاد سماجی حالات کی بڑی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ منظر کشی کی گئی ہے۔ افسانہ اپنے خوبصورت انداز بیان کا شاہکار لگتا ہے

صوفی غلام محمد کے افسانوں میں ادب برائے زندگی کا عنصر غالب ہے وہ خود اپنے ایک افسانوی مجموعے میں رقم طراز ہیں:

''افسانہ کیا ہے اور اس کا براہِ راست اثر زندگی پہ کیا مرتب ہوتا ہے۔ یہ نکتہ آج تک کئی انداز سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر کوئی ادب اپنے اردگرد کے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ایک انسان اپنے وقت اور ماحول کا عکس دیکھتا ہے۔ افسانہ ادب کی ایک نازک صنف ہے اور یہ صنف آج کل ہر جگہ اپنے رنگ اور اپنے انداز میں اپنے ارتقا کی راہ پہ گامزن ہے۔۔ ایک معمولی بات کو افسانے میں پیش کر کے قاری پر ایک اثر قائم کرنا، ایک ایسا اثر جو زندگی کو صحیح معنوں میں ایک نیا رنگ و روپ عطا کرتا ہے۔ ایک افسانہ جتنا زندگی اور حقیقت کے قریب ہوتا ہے اُتنا ہی وہ قاری پر اثر انداز ہو جاتا ہے''

صوفی صاحب نے بے شک انہی باتوں کو اپنے ہر افسانے کی بنیاد بنایا ہے۔ وہ انٹی کلائمکس، کلائمکس، تجسس، تحیر، تغیر کے رنگوں سے افسانے کو سجانے کی بجائے ایک سیدھے سادھے پُراثر بیانیئے سے قاری تک افسانہ پہنچا دیتے ہیں اور وہ اُس میں اپنی جگہ پہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ''یاون تہ تاون'' افسانے کا ہی جائزہ لیں تو بات بس اتنی سی ہے اور جسے بار بار مختلف جگہوں پہ مکرر بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص رئیسانہ زندگی گزار کر اپنے آپ

پہ گزرتی عمر کے نقوشِ تند و تیز اُبھرنے نہیں دیتا اور دوسری جانب دوسرا شخص محنت و مشقت کی زندگی گزار کر اپنے ہم عمر لوگوں کے لئے عمر رسیدہ شخص بن جاتا ہے۔ کسی کے لئے جیسے وقت پھلانگیں مارتا ہے اور کسی کے لئے جیسے ساکت ہو جاتا ہے۔ تبھی تو اس افسانے میں ''مہدہ صاب'' شیلہ اور اُس کے شوہر کے ساتھ اُس کا باپ سمان شخص اور شیلا کا والد شمبھوناتھ بھی اُسے ''مہدہ بب'' کہہ کے پکارتا ہے۔... بظاہر بات معمولی سی ہے لیکن انسانی جذبات اور فطرت کو جس انداز سے تین کرداروں کی اس کہانی میں بیان کیا گیا ہے اُس نے اس معمولی نکتے کو بھی ایک اہم احساس کا درجہ عطا کیا ہے۔

صوفی صاحب کی متعدد کہانیاں طویل ہوتے ہوئے بھی قاری کو اُکتاہٹ کا شکار نہیں بناتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے صوفی صاحب کی زبان و بیان پہ دسترس۔ ان کی کہانیوں کے کردار قاری کے سامنے نہیں بلکہ اُس کے کان میں سرگوشی کر کے اس کا بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ اُن میں سے ہی ہیں اُن سے الگ نہیں۔ اُن کی ہر کہانی قاری کی کہانی ہے اور بقول صوفی صاحب افسانہ جتنا زندگی اور حقیقت کے قریب ہوتا ہے اُتنا ہی وہ قاری پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔

ایک اہم نکتہ جسے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا وہ یہ کہ صوفی صاحب کے اپنے مخصوص ٹریٹمنٹ سے قطع نظر یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اُن کے کچھ افسانے محض کسی کردار کا خاکہ ہی پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں ''احمد ریشی'' اور ''خبر کیاز'' کا ذکر کرنا اہم ہے۔ احمد ریشی ایک فٹ بال کھلاڑی ہے۔ فٹ بال کا دیوانہ ہے۔ نسل در نسل کھیل رہا ہے۔ پہلے باپ کے ساتھ کھیلتا تھا اب اپنے بیٹے کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اس ''افسانے'' میں نہ کوئی کہانی پن ہے۔ نہ ہی افسانوی رنگ۔ اسی نوعیت کی ایک اور تحریر ہے۔

''خبر کیاز'' ایک عام سا افسانہ ہے جس کی گرہیں پہلے ہی کھلتی ہیں حالانکہ اس کا سماجی پیغام اس بات کا مظہر ہے کہ حاملہ عورت کو فطری طور پر ابتدائی ایام میں کن کن کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے۔

ان تمام تاثرات کے باوجود یہ بات صوفی صاحب کو انفرادیت پہ ایک مقام عطا کرتی ہے کہ اُنہوں نے عام کرداروں کے ذریعے بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے جو اُن کی تحریروں کی نمایاں خوبی ہے۔

اُن کے افسانے کشمیر اور کشمیریت کے عکاس ہیں۔ بیشتر کشمیر کے عام گھروں کی داستان ہیں۔
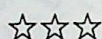
☆☆☆

☆☆☆

☆......ولی محمد خوشباشؔ

صوفی غلام محمد کے افسانوں میں کردار نگاری

صوفی غلام محمد کا شمار کشمیری زبان کے اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو اس زبان کے اولین افسانہ نگار شمار کیے جاتے ہیں۔ صوفی صاحب نے جس دور میں افسانوی میدان میں قدم رکھا وہ اس کا اِبتدائی دور تصور کیا جاتا ہے۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ چھپنے تک صرف دو چار افسانوی مجموعے چھپ چکے تھے۔ جن میں اختر محی الدین کا ''ست سنگر'' اور ''سونزل'' نام کے دو افسانوی مجموعے اور اوتار کرشن رہبرؔ کا ''تبرک'' اور بنسی نردوش کا افسانوی مجموعہ ''بال مرایو'' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

صوفی غلام محمد کے دو افسانوی مجموعے 1962ء میں ''شیشہٕ تہٕ سنگستان'' اور لوٗسہٕ متیٕ تارکھ'' نام سے منظرِ عام پر آئے اور خاصے مقبول ہوئے ہیں۔ اِن افسانوی مجموعوں میں ''یاوٗن تہٕ تاون''، مال دبد، تُرزہ کھوٚر، احمد ریشۍ، خبر کیاز، نوش لب تہٕ عجب ملک، جان دبد، رمضان بٹہٕ، پرٛکاش کول، علی ناوِد، نُور شالہ، سلطان تولہ اور مال دبد عنوان کے افسانے شامل ہیں۔ اِن افسانوں میں صوفی غلام محمد کا خوبصورت اندازِ بیان قاری کے دِل کو چھو لیتا ہے اور وہ افسانوں کے کرداروں سے محفوظ ہوتا ہے۔ اِن افسانوں میں جو منظر کشی، پلاٹ، زمان و مکان، زبان و بیان، علامت و استعارے استعمال کیے گئے ہیں وہ اِن افسانوں کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ اِن افسانوں میں جہاں روایتی افسانوں کی طرح اِنسان کی عظمت اور اُس

کے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر اور اُس کے ایثار و قربانی، اُس کا طرزِ زندگی، معمولات زِندگی میں طرح طرح کے استحصال کے پیکر میں ڈھلتے چلے جانے کا ایک بتدریج اور مُسلسل عمل ملتا ہے وہاں یہ افسانے اپنے دور کی سماجی زندگی کی بھی ایک بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ صوفی غلام محمد کے اکثر افسانوں کی کردار نگاری میں واقعات کے اُتار چڑھاو کے دوران میں ایک دلچسپ نفسیاتی نشیب و فراز پایا جاتا ہے۔ افسانے کا تانا بانا بننے میں کردار جو اہم رول ادا کرتے ہیں وہ افسانے کی پلاٹ بندی اور اُس کے متن میں ایک نئی روح ڈالتے ہیں۔ جیسے کہ صوفی غلام محمد کے اکثر افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ کے تحریر کردہ افسانوں میں ایک مشہور افسانہ علی نآوِد ہے۔ اس افسانے میں جو صدیق آشپاز اور علی نآوِد نام کے کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کی داستان بیان کی گئی ہے وہ ایک وسیع سماجی صورتِ حال کو گرفت میں لیتے ہیں۔ اِس افسانے کے کرداروں کے ذریعے زندگی کی کڑوی سماجی سچائیوں کو دریافت کیا گیا ہے۔ اِس افسانے کے کردار سماجی تانے بانے کے وہ جیتے جاگتے نمونے ہیں جو اگرچہ معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے اُلجھتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہر وقت اُس منظر نامے کی عکاسی کرتے ہیں جو اکثر ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کی تقاریب میں ماضی میں دیکھنے کو ملتا تھا اور اگرچہ اِس منظر نامے کی پرچھائیاں اب بھی ہمارے دیہی معاشرے میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں لیکن یہ پرچھائیاں اُس دور کی یاد دِہانی کراتی ہیں جب ہمارے غربت، افلاس، سماجی نابرابری اور تعلیمی پسماندگی اپنے عروج پر تھی۔

صوفی غلام نے اپنے افسانوں میں اپنے گِرد و پیش رونما ہونے والے حادثات اور واقعات سے شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنے مشاہدے اور فِکر و فن کی گہرائی اور نفسیاتی کیفیات سے اِس طرح اپنے افسانوں کی ساخت تیار کی ہے جو قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رکھ سکتی۔ آپ کے افسانوی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ آپ کے ہر افسانے کے موضوع، مواد، کردار، احساسات اور خدمات میں انفرادیت کا پرتو جھلکتا ہے۔ آپ کے افسانوں میں جو کرداروں کا فنکارانہ برتاو نظر آتا ہے، اُس کی وجہ سے یہ افسانے بڑی مدت

تک یاد کیۓ جائیں گے۔ صوفی غلام محمد کے اکثر افسانوں کا موضوع جہاں غربت، افلاس، استحصال، مزدوری، معاشرتی بکھراؤ، ٹوٹتے بکھرتے اِنسانی رِشتے ہیں وہاں اِن افسانوں کے ِکردار ہماری زندگی کے وہ لوگ ہیں جو سماجی نابرابری، استحصال اور احساسِ برتری میں یقین رکھتے ہیں۔ آپ کے افسانوں کے ِکرداروں کی نفسیات جس طرح آپ کے افسانوں کے پلاٹ کو اثر انداز کرتی ہے اور جس جمالیاتی احساس سے روشناس کراتی ہے اُسی طرح اِن افسانوں کے مطالعے کے لئے قاری کو بھی محفوظ کرتی ہے۔ صوفی غلام محمد کے افسانوں میں بعض ِکردار ایسے ہیں جو حقیقت اور تخیُّل سے مُزیّن ہیں۔ جیسے ''لۆسۍ مِتۍ تارکھ'' افسانوی مجموعے کے افسانہ علی نٲوِد کے ِکردار علی نٲوِد اور رووستہ صدیق یا اِسی کتاب میں درج ''سلطان تولہ'' افسانے کا سلطان تولہ۔ یہ تینوں ِکردار ایسے لوگوں کے چہرے بے نقاب کرتے ہیں جو نیکی اور اچھائی کا مُرقع ہوتے ہیں اور اپنی چالاکی، صاف سُتھری زندگی اور اپنے قول و فعل سے اِنسان اور اِنسانیت کا معیار متعین کرنے کا درس دیتے ہیں۔

اِسی طرح ''شیشہِ تہٕ سنگستان'' افسانوی مجموعے کا افسانہ ''ژِنہِ ژور'' کا محمد جو جہاں نہایت ہی خوددار اور چالاک ہوتا ہے وہاں وہ اپنے ساتھیوں عبداللہ اور غنی کی اپنے مالک سلطان صوفی کے ناروا سلوک اور بدکلامی کو برداشت نہیں کرتا ہے اور اُن میں وہ ایسا جذبہ جگانے کی کوشش کرتا ہے جو اُن کو باغیرت شہری بنا سکے۔ اپنے مالک سلطان صوفی کی طرف سے مزدوروں پر کیۓ جانے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت دلا سکے۔ یہ تینوں کردار اُس استحصال کی عکاسی کرتے ہیں جس دور میں غریب اور لاچار مزدروں کا اکثر کارخانہ دار اپنی عیاری اور مکاری سے معمولی معاوضے کے عوض استحصال کرتے تھے۔ اِن ِکرداروں میں محمد و نام کا ِکردار خوددار، دوٹوک باتیں کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اُس کی باتیں اگرچہ بعض دفعہ تلخ بھی ہوتی ہیں لیکن اُن میں ہمدردی کا جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد و افسانے کے دیگر دو ِکرداروں عبداللہ اور غنی کو ژِنہِ ژۆر طنزاً کہہ دیتا ہے تا کہ اُن میں بھی خودداری کا جذبہ جاگ اُٹھے۔

صوفی غلام محمد کے افسانے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں سماج اور معاشرے کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے اور وہ معاشرے اور سماج کے پیچ وخم کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ''یاوُن تہٕ تاون'' اور افسانہ ''مال دید'' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ افسانہ یاوُن تہٕ تاون میں ''شیلا'' اور مہدہ بب اگرچہ ہم عمر ہوتے ہیں لیکن شیلا پر ڈھلتی عمر کا ایسا کوئی اثر نہیں ہوتا جیسا کہ مہدہ بب پر ہوتا ہے۔ اِن دونوں ،کرداروں کا تقابلی مطالعہ اِس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ غریب اور پسماندہ طبقوں کے مرد اور خواتین جہاں ڈھلتی عمر کا سایہ پڑتے ہی طرح طرح کے سماجی مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں وہاں انہیں شادی بیاہ کے معاملے میں بھی بے پناہ مشکلات آتی ہیں۔

افسانہ مال دید میں مال دید کا ،کردار جہاں محنت شاقہ سے اپنا روزگار کمانے والی ایک پُرعزم اور باہمت خاتون کا ،کردار ہے وہاں سماج کے اُن خودغرض لوگوں کے ،کردار کی بھی عکاسی کی گئی ہے جو مال دید کی روزی روٹی پر لات مار کر اور اس کو ناکردہ گناہوں کا شکار بنا کر اُسے ذلیل اور رسوا کرتے ہیں۔ اِس افسانے میں افسانہ نگار نے اپنے مشاہدات کی روشنی میں ،کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کو فنی اعتبار سے پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار کی نہ صرف سماج پر گہری نظر ہے بلکہ وہ سماج کے اُن استحصالی عناصر سے بھی متنفر ہیں جو سماج کے پسماندہ طبقوں کا مذاق اڑانے میں اپنی قلبی اور ذہنی آسودگی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اِن ،کرداروں کا براہ راست واسطہ ہماری سماجی اور معاشی نفسیات اور مادیت پرستی سے ہے۔

صوفی غلام محمد کا اپنا ایک انفرادی اسلوب ہے۔ وہ افسانے کو اِس دلکش پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ قاری اپنے آپ اِس سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ اُن کے زبان وبیان کا نظام بہت ہی سلجھا ہوا ہے۔ وہ اکثر ،کرداروں کے ڈائیلاگ اِس طرح تحریر کرتے ہیں کہ جیسے وہ لفظوں سے کھیلتے ہیں اور بات میں بات پیدا کرنے میں مہارت سے کام لیتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں عام فہم ہیں اور روزمرہ زندگی کے حالات پر لکھی گئی ہیں۔ آپ کی کہانیوں میں جو کردار دیکھنے کو ملتے ہیں اُن کے مکالمے جہاں چست ہیں وہاں دلچسپ بھی ہیں۔ ایسا

لگتا ہے کہ ایک ایک لفظ کرداروں کی مناسبت سے تحریر کیا گیا ہے۔ اِن مکالموں میں فطری بے ساختگی ہے جو کہانی کے بہاؤ میں خلل نہیں ڈالتی۔

صوفی غلام محمد کا تحریر کردہ افسانہ پرکاش کول میں زمان ومکان کے لحاظ سے کشمیر کے اُس بھائی چارے کی صدیوں پُرانی روایات کی عکاسی کی گئی ہے جو آج بھی دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس افسانے کے کردار پرکاش کول اور عمہ وانی اِسی بھائی چارے کی جیتی جاگتی داستان بیان کرنے میں ہر مرحلے پر کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ افسانے میں جہاں پرکاش کول، عمہ وانی اور دیگر محلے والوں کا چہیتا اور ہمدرد آدمی ہوتا ہے وہاں اُس کی باتوں میں جو مٹھاس اور زندگی کا تجربہ ہوتا ہے وہ افسانے کو شاہکار بناتے ہیں۔ اِس افسانے کے کرداروں میں محبت اور امن کا پیغام ہے۔ اِس افسانے کے کرداروں میں ایسی جیتی جاگتی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ قاری خود کو اِسی منظرنامے کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار کردار سازی میں بھی اپنا جواب آپ ہے۔

آپ کے افسانہ ''عجب ملک تہٕ نوش لب'' میں جہاں رومانیت اور جنسیات کی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ وہاں اِس افسانے کے کرداروں کے ذریعے نفسیات کا ایک عمدہ نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے جو سماجی رسم ورواج کے دائرے میں اُس حقیقت کو واضح کرتے ہیں جو معاشی اعتبار سے غریب اور پسماندہ گھرانے میں ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اِس کہانی کا Treatment جہاں بولڈ ہے وہاں فنی اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔

صوفی غلام محمد کے افسانوی کرداروں میں جس داستانِ حیات کی لفظوں کے ذریعے عکس بندی دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے افسانوں کے کرداروں میں جہاں زندگی کا چہرہ نظر آتا ہے وہاں دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ آپ کے افسانوں میں بہت سے ایسے جیتے جاگتے آئینے ہیں جن میں فرد اور سماج اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

☆☆☆

☆......خورشید عالم خان

صوفی غلام محمد کی صحافتی خدمات

صوفی غلام محمد ریاست کے ایک نامور صحافی تھے جن کی صحافتی خدمات نصف صدی کو محیط ہیں۔ کشمیر میں اردو صحافت کو پروان چڑھانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ کشمیر کی اُردو صحافت کے اہم ستون ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران سینکڑوں اخبار منظر عام پر آئے اور صحافتِ کشمیر میں کئی نئے ابواب کا اضافہ کرنے کے بعد بند ہو گئے لیکن ''سرینگر ٹائمز'' بے پناہ مشکلات اور بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کے باوصف طویل عرصہ سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یہ کشمیر کے سیاسی، سماجی اور عسکری حالات و واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ عوامی، انتظامی اور سیاسی حلقوں میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

صوفی غلام محمد 1932ء میں بچھوارہ ڈلگیٹ میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم درگجن سکول میں حاصل کی۔ 1956ء میں انہوں نے صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ''خدمت'' سے کیا جس کے منتظم اس وقت بخشی غلام محمد کے معتمد سابق وزیر اعظم شمس الدین تھے۔ اخبار کے مدیر نند لال واتل کی رہنمائی میں صوفی صاحب نے صحافتی اسرار و رموز سیکھے اور سب ایڈیٹر بن گئے۔ صوفی صاحب 1966ء تک ''خدمت'' سے وابستہ رہے۔ اسی دوران اخبار کی انتظامیہ کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے اور انہیں ''خدمت'' سے نکال دیا گیا۔ صوفی صاحب کے بقول دراصل یہ اقدام ادارتی عملہ کی رقابت کا نتیجہ تھا۔ ''خدمت'' کی ملازمت سے برطرفی پر انہوں نے سابق وزیر اعظم خواجہ

شمس الدین جو روزنامہ ''خدمت'' کے اس وقت چیئرمین تھے، کے خلاف ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا جو مسترد ہوا۔ اس پر صوفی صاحب نے سیشن کورٹ میں اپیل کی جو منظور کی گئی۔ صوفی غلام محمد نے ''خدمت'' سے برطرفی کے بعد بخشی غلام محمد کے اخبار ''نوائے کشمیر'' کی ادارت کے فرائض سنبھال لئے۔ بخشی صاحب جو اخبارات کو معیوب نظروں سے دیکھتے تھے بالآخر اپنے سیاسی حریف خواجہ غلام محمد صادق کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک اخبار نکالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ اخبار 1966ء میں شائع ہوا۔ اس کے پہلے مدیر بدری ناتھ منٹو اور پھر جی ایم ڈار مقرر ہوئے۔ صوفی غلام محمد کے دورِ ادارت میں یہ روزنامہ بن گیا۔ ''نوائے کشمیر'' غلام محمد صادق اور میر قاسم پر ذاتی حملے کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ پرمیشوری ایجی ٹیشن کے دوران ''نوائے کشمیر'' نے صادق صاحب کے خلاف زبردست ہنگامہ برپا کیا۔ صوفی غلام محمد کے مطابق صادق صاحب کی مخالفت کے باعث ''نوائے کشمیر'' پنڈت برادری اور نیشنل کانفرنس کے حامیوں میں زبردست مقبول ہوا جبکہ عام مسلمان ''آفتاب'' پڑھتے تھے۔

صوفی غلام محمد پارٹی سیاست سے بالاتر ہو کر صحافتی میدان میں اپنے منفرد مقام کی تلاش و جستجو میں مگن تھے۔ وہ منفی صحافت سے اکتا چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنا اخبار نکالنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ ''سرینگر ٹائمز'' کی ڈیکلریشن حاصل کرنے کے لئے انہیں تین سال تک مسلسل جدوجہد کرنا پڑی۔ ''سرینگر ٹائمز'' کی ڈیکلریشن کے لئے 1966ء میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر کو ایک درخواست دی گئی۔ پریس رجسٹرار آف انڈیا نے ''سرینگر ٹائمز'' کے ٹائٹل کی تصدیق کر دی لیکن جب ڈیکلریشن حاصل کرنے کے لئے صوفی غلام محمد نے اخبار کے ٹائٹل اور اس سے متعلقہ دیگر کاغذات کی فائل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر مسٹر ٹائٹس (Mr. Tytus) کے دفتر میں داخل کی تو مجسٹریٹ نے فائل کو التوا میں رکھ دیا۔ ''سرینگر ٹائمز'' کی فائل پولیس کے سی آئی ڈی محکمہ کو پیش کی گئی۔ نو ماہ تک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ بالآخر پولیس نے لکھا

''چونکہ اخبار کے ایڈیٹر صوفی غلام محمد ''خدمت'' میں سب ایڈیٹر تھے اور اس کے بعد بخشی غلام محمد کے اخبار ''نوائے کشمیر'' کے ایڈیٹر بن گئے تھے، اس لئے ''سرینگر ٹائمز'' جو اُس کا ذاتی اخبار ہے یقیناً بخشی غلام محمد کی حمایت کرے گا'۔ ایک لمبی قانونی جنگ لڑنے کے بعد انہیں اخبار کی ڈیکلریشن مل گئی۔ ''سرینگر ٹائمز' کا پہلا شمارہ 16 جنوری 1969ء کو سرینگر سے شائع کیا گیا۔ یہ ایک ہفتہ روزہ اخبار تھا جو یکم اگست 1969ء کو روزنامہ بنا۔

اخبار کے پہلے شمارے کے اداریہ میں اس بات پر سخت تنقید کی گئی تھی کہ کشمیر میں صحافت نمایاں کردار ادا کرنے کی بجائے سیاسی جماعتوں کی حاشیہ بردار بنی ہوئی ہے۔ اخبار لکھتا ہے:

''کشمیر میں صحافت کا المناک پہلو یہ ہے کہ یہاں سیاست صحافت سے نہیں بلکہ صحافت سیاست سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت ہی غلط اور تباہ کن رجحان ہے۔ یہ رجحان اگر تقویت حاصل کر گیا تو ریاست میں صحافت اپنے مرتبے سے گر جائے گی اور اس کے نتائج خود اخبار والوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوں گے۔''

صوفی غلام محمد نے کشمیر میں صحت مند اور مثبت صحافت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ صوفی صاحب عزمِ مصمم اور عملِ پیہم میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے ''سرینگر ٹائمز'' کو ایک کامیاب اخبار بنانے میں ہر وہ قربانی دی جو اس وادی پُر خار میں مطلوب تھی۔ کئی بار اخبار کو پابندیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اخبار کی پالیسی پر اثر انداز ہونے کے لئے ترغیب و تحریص کا نسخہ بھی آزمایا گیا لیکن صوفی صاحب نے صحافتی اصولوں پر سودا بازی نہیں کی۔ وہ ایک صاف گو اور بے باک صحافی تھے۔

صوفی غلام محمد نے محض ایک نئے اخبار کا اضافہ کرنے کے لئے لمبی قانونی جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ وہ شعوری طور پر صحافت کی اہمیت و افادیت کے قائل تھے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ کشمیر سے جو بھی اخبار جاری ہوتے تھے، وہ کسی سماجی یا سیاسی جماعت کے

ترجمان تھے۔ آزادانہ خبروں کے حصول کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں تھا۔ روزنامہ ''آفتاب'' کے علاوہ کسی بھی اخبار کو عوامی اعتبار حاصل نہ تھا۔ اُس لئے انہوں نے ''سرینگر ٹائمز'' کو ایک آزاد خیال اخبار کی صورت میں شائع کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ''سرینگر ٹائمز'' نے عوام نواز پالیسی اختیار کر کے ایفائے عہد کا ثبوت دیا اور عوامی جذبات کا ترجمان ثابت ہوا۔ ''سرینگر ٹائمز'' نے حقائق پیش کر کے اپنے مخصوص انداز میں حکومت کی خامیاں اور کوتاہیاں بے باکانہ طور پر عیاں کیں۔ ایک اخبار کی کامیابی کا راز اور ضمانت اس کا عوامی مزاج اور مقبولِ عام سوچ کی ترجمانی ہوتا ہے۔ ''سرینگر ٹائمز'' کی بے لاگ اور بے باک تحریروں نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور مختصر سی مدت میں اخبار کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ یہ وہ دور تھا جب اخبار بینی کا شوق زیادہ نہیں تھا۔ ''سرینگر ٹائمز'' کے پہلے شمارہ میں مختلف لوگوں کے بیانات اور تاثرات بھی شاملِ اشاعت کئے گئے تھے۔ اکثر اخبارات سیاسی جماعتوں کے ترجمان ہونے کی وجہ سے تنظیمی کارکنوں کو مفت فراہم کردیئے جاتے تھے۔ اس لئے اخبار خرید کر پڑھنے کا مزاج منقود تھا۔ عام لوگ اخبارات سے لاتعلق رہتے تھے۔ لیکن جب ''سرینگر ٹائمز'' نے لوگوں کے جذبات اور امنگوں کے مطابق خبروں کی ترسیل ممکن بنائی تو ایک مثبت تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اخبار کی مانگ روز بروز بڑھنے لگی۔ ''سرینگر ٹائمز'' نے جب آنکھ کھولی تو ریاست جموں وکشمیر کی سیاسی فضا کافی گرم تھی۔ خواجہ غلام محمد صادق کی سربراہی میں کانگریس سرکار برسر اقتدار تھی۔ خواجہ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم کے درمیان اختلافات وسیع ہوتے جارہے تھے۔ صوفی صاحب نے راقم کو ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ مفاہمت کے معاملہ کو لے کر وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق اور وزیر داخلہ کے درمیان گیسٹ ہاؤس میں بات چیت کے دوران سخت تکرار بھی ہوئی تھی جس میں غلام محمد صادق نے انہیں ریاست سے فوراً واپس چلے جانے کے لئے کہا تھا۔

شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ طویل جلاوطنی اور قید و بند کے بعد رہا کئے جا چکے تھے۔ محاذ رائے شماری الیکشن میں حصہ لینے کے لئے پر تول رہی تھی اور شیخ محمد عبداللہ

دہلی میں مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے مذاکرات میں مصروف تھے۔ سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد اپوزیشن میں تھے اور نیشنل کانفرنس کی قیادت کر رہے تھے۔ ''سرینگر ٹائمز'' نے ان تمام سیاسی تبدیلیوں اور سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی اور اپنی خبروں میں جہاں برسر اقتدار جماعت کے بیانات اور اعلانات کو جگہ دی وہیں حزبِ اختلاف اور محاذ رائے شماری کی سیاسی سرگرمیوں کو بھی اجاگر کیا۔ سیاسی اتھل پتھل کی رپورٹنگ کے دوران اخبار نے قارئین کو حالات و واقعات سے غیر جانبدارانہ آگاہی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ واقعات کے پسِ منظر اور پیشِ منظر کی جانکاری دینے کے لئے بے باک تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سیاسی جماعتوں کے اختلافات سے عام لوگ غیر معمولی دلچسپی لینے لگے۔ ''سرینگر ٹائمز'' نے عوامی بیداری اور سیاسی شعور کی پختگی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

''سرینگر ٹائمز'' کا دفتر ابتدا میں ہوٹل تاج کے ایک کمرے میں تھا جو ادارہ اوقاف اسلامیہ کی ملکیت تھا۔ اُس دور میں حزب اختلاف کی کسی بھی پارٹی کا کوئی اپنا اخبار نہ تھا۔ ''سرینگر ٹائمز'' میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور بخشی غلام محمد کی سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے خبریں چھپتی تھیں۔ صوفی غلام محمد نے واضح طور پر کسی بھی جماعت کا ترجمان بننے سے انکار کر دیا تو انہیں ''ہوٹل تاج'' سے بے دخل کر دیا گیا۔ ''سرینگر ٹائمز'' کے لئے یہ زمانہ کافی مالی پریشانیوں کا تھا۔ صوفی صاحب کے مطابق ''مالی تنگدستی اتنی زیادہ تھی کہ ایک پرچہ نکالنے کے بعد فکر لاحق ہوجاتی تھی کہ دوسرا پرچہ نکلے گا بھی یا نہیں۔'' کورٹ روڈ پر ایک معمولی سا ٹوٹا پھوٹا کمرہ حاصل کر لیا گیا لیکن کسی بھی سیاسی جماعت یا شخصیت کے دباؤ کے سامنے صوفی صاحب نے اپنا سر تسلیم خم نہیں کیا۔ کشمیر کی سیاسی تبدیلیوں، ہنگامہ آرائیوں اور انقلابات نے کئی رُخ تبدیل کئے۔ اس ہنگامہ خیز صورتِ حال میں ''آفتاب'' اور ''سرینگر ٹائمز'' نے صحافت کے اعلیٰ اقدار اور اپنی آزادانہ روش کو برقرار رکھا۔ اہم سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے اگرچہ بارہا تیز و تند ہوائیں چلیں، کئی طوفان آئے اور تھم گئے، فنا و بقا کے کئی مرحلے آئے لیکن ''آفتاب'' اور ''سرینگر ٹائمز'' نے تندیٔ بادِ

مخالف کا مردانہ وار مقابلہ کر کے نہ صرف اپنا وجود قائم رکھا بلکہ صحت مند صحافت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

''سرینگر ٹائمز'' کی مقبولیت میں کارٹون نویسی کا بنیادی کردار رہا ہے۔ بشیر احمد بشیرؔ نے اپنی جدت پسند طبع سے کارٹون نویسی میں ایک بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔ اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ صرف کشمیر بلکہ بیرونِ ریاست بھی کیا جاچکا ہے۔ بہت سے لوگ صرف کارٹون کی وجہ سے ''سرینگر ٹائمز'' خریدتے تھے۔ بشیر احمد بشیرؔ گزشتہ چار دہائیوں سے کارٹون بنا رہے ہیں۔ اُن کے کارٹونوں کا چرچا گھر گھر ہے بلکہ ''سرینگر ٹائمز'' کے قارئین اہم سرخی اور شہ سرخی سے قبل کارٹون دیکھنے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ ان کی کھینچی ہوئی لکیریں خیال اور فن دنوں اعتبار سے کافی معیاری ہوتی ہیں۔

صوفی غلام محمد نے ''سرینگر ٹائمز'' کو مقبولِ عام بنانے کے لئے ناموافق اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود ہر قربانی دی۔ ان کا خمیر صحافت سے اٹھا تھا۔ صحافت ان کا پہلا اور آخری عشق تھا۔ نہایت عسرت اور تنگدستی کے عالم میں انہوں نے تنِ تنہا اخبار شروع کیا۔ دو کاتبوں کے علاوہ بشیر احمد بشیرؔ اور محمد یوسف صوفی اُن کے دست و بازو تھے جو اخبار کی اشاعت میں بھی معاون بن گئے۔ صوفی محی الدین بھی ''سرینگر ٹائمز'' سے زیادہ دیر تک دور نہ رہ سکے اور اپنے بھائی کے مشن میں شامل ہوگئے۔ صوفی صاحب نے اپنے گھر کے افراد سے ہی کام لیا اور اخبار کو ترقی کی منازل طے کروائیں۔ لیکن اس اخبار کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ عوام میں کبھی بھی یہ تاثر پیدا نہیں ہوا کہ ''سرینگر ٹائمز'' ایک ''فیملی'' اخبار ہے۔ کالم نگاروں، ادیبوں اور مضمون نویسوں نے ''سرینگر ٹائمز'' میں چھپنا اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھا۔ صوفی صاحب نے بھی ہر لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کی اور اخبار کے صفحات اُن کے لئے وقف کردیئے۔ آج ''سرینگر ٹائمز'' ریاست کا ایک مقبولِ عام روزنامہ ہے۔

صوفی غلام محمد نے کئی غیر ملکی اسفار کئے۔ انہوں نے پڑوسی ملک پاکستان کا سفر 5 مرتبہ کیا۔ وہ سویت روس، امریکہ، عراق، ایران اور سعودی عرب بھی گئے۔ انہوں نے کئی

بین الاقوامی سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں بھی کیں جن میں سویت روس کے صدر گوربا چیوف، امریکہ کے سابق صدر کلنٹن، عراق کے معزول و مقتول صدر صدام حسین، ایران کے روحانی پیشوا علی خامنہ ای بطور خاص شامل ہیں۔ صوفی صاحب نے اپنے دورۂ سویت روس کے تاثرات و مشاہدات ''ہمالیہ سے پامیر تک'' 1988ء میں ''سرینگر ٹائمز'' میں کئی قسطوں میں شائع کئے۔ ایران کے تاثرات ''ایران صغیر سے ایران کبیر تک'' مارچ 1990ء میں اسی اخبار میں پانچ قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ صوفی صاحب اپنی نصف صدی کی صحافتی زندگی اور کشمیر کے سیاسی اور ثقافتی حالات پر ایک کتاب تحریر کر چکے تھے جو کمپیوٹر کتابت کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی کہ داعی اجل نے لبیک کہہ دیا۔ کتاب کا مجوزہ نام ''گمشدہ وادی، برگشتہ لوگ'' تھا۔ یقیناً ان کی اپنی خودنوشت سوانح عمری کشمیر کی صحافت اور سیاست پر ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

صحافت کے ساتھ ساتھ ادب سے ان کی دلچسپی مسلمہ تھی۔ کشمیری زبان کو اُنھوں نے چند بہترین کہانیاں دیں جن میں ''ژنہِ ژور'' کافی مقبول و مشہور ہوئی اور کشمیری زبان میں ایک نمائندہ کہانی تسلیم کی گئی۔ ان کی کشمیری کہانیوں کے دو مجموعے ''لۆسۍ مَتۍ تارکھ'' اور ''شیشہِ تہٕ سنگستان'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان دونوں افسانوی مجموعوں پر انہیں کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے انعامات سے نوازا گیا۔ صوفی صاحب ریڈیو کشمیر سے حالاتِ حاضرہ پر مبنی پروگرام ''رفتارِ زمانہ'' بھی پیش کیا کرتے تھے اور کئی مباحثوں میں شریک ہوتے تھے۔

☆☆☆

☆......مرزا بشیر احمد شاکر

صوفی غلام محمد - اُردو صحافت کا درخشندہ ستارہ

''میں جب اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہوں کہ وقت کے تیز بہاؤ نے میرے آگے بڑھنے کی رفتار کو توڑ دیا ہے یا میری اپنی رفتار میں اتنی تیزی اور سرعت ہے کہ وقت کا پہیہ اِس کے ساتھ قدم نہیں ملا سکتا۔ کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ میری زندگی کے شب و روز بیکار میں گزر گئے ہیں۔ میں نے وقت کا فائدہ نہیں اٹھایا اور میں ان انسانوں کی صف میں کھڑا ہو گیا جو کنارے پر بیٹھ کر صرف دریا کی لہریں گنتے ہیں۔ دریا میں اُتر کر اس کا دم خم نہیں دیکھتے۔ کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میری اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کا ظرف وقت کے پیمانے سے بڑا ہے۔''

درج بالا اقتباس اُس شخص کی یادوں کو تازہ کرتا ہے جو ادبی دُنیا اور صحافتی اداروں میں صوفی غلام محمد کے نامِ نامی سے مشہور ہیں۔ صوفی غلام محمد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ علم و ادب کی دنیا میں انہوں نے ''سرینگر ٹائمز'' کے نام سے اخبار نکال کر اپنی ایک خاص پہچان بنائی تھی اور اپنی شخصیت کا لوہا منوایا تھا۔ بظاہر صوفی غلام محمد کا چہرہ بہت ہی

باوقار، گورا نکھرا ہوا رنگ و روپ اور متبسم نظر آتا تھا۔ ناک نقشہ صاف وشفاف تھا۔

وقت کی تیز اور تند آندھیوں کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے مرحوم صوفی صاحب نے سرینگر ٹائمز کی نورانی شمع کو فروزاں کرتے ہوئے سماجی، سیاسی اور دیگر مسائل سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کی۔ اُن کا قلم بے باک تھا اور ان کا ضمیر بیدار۔ اُن کے جی میں حقائق پر مبنی جو کچھ بھی آتا تھا وہ بلا کسی خوف اور ڈر کے زیبِ قرطاس کرتے تھے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دِل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

وقت کے بااختیار حضرات نے اگرچہ صوفی صاحب کو خریدنے کی بھی کوششیں کی تھی اور زر و جواہر کے خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی ان کو پیش کش بھی کی تھی مگر اس آہنی عزم وارادہ کے مالک نے ان ساری کوششوں کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا اور اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر کسی بھی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے اخبار کے ذریعہ سنجیدہ مسائل پر قلم اٹھایا۔ خوش آمد اور چاپلوسی سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ عوام الناس اور غریب طبقہ کے لوگوں کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کی اور ان کے مسائل کو اُجاگر کرتے رہے۔ اپنی نگارشات اور قلم کی جولانیوں سے ہمیشہ جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ثابت کرتے رہے۔ اگرچہ بہت سارے ابن الوقت اُن کی اِس روش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بقول اقبالؒ:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلال کو کبھی کہہ نہ سکا قند

صوفی غلام محمد ڈلگیٹ سرینگر کے صوفی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے بارے میں وہ خود یوں رقمطراز ہیں:

''مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں کس دِن اور کس سال پیدا ہوا ہوں۔
میرے والدین نے مجھے اپنے یوم پیدائش کے بارے میں کچھ نہ بتایا

اور بتاتے بھی کیوں جبکہ ان کو اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرا جو بڑا بھائی ہے اور میرے جو چھوٹے بھائی، بڑی اور چھوٹی بہن ہے ان کو بھی اپنے یوم پیدائش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرا باپ جب علاقے کے پرائمری سکول جبری سکول، مجھے داخل کرانے کے لئے لے گیا تو میری عمر وہاں سات سال درج کرائی گئی۔

آپ آگے لکھتے ہیں:

''ہمارا سکول درگجن میں واقع تھا۔ اس میں تعلیم پانے کیلئے پانپور اور شالیمار سے بھی لڑکے پیدل چل کر آتے تھے۔ کچھ لڑکوں کے پاؤں میں جوتے بھی نہ ہوتے تھے۔ وہ کھلی فضاؤں میں روز دس سے پندرہ میل کا سفر طے کرتے اور کوئی تھکان محسوس نہ کرتے۔ کھلی اور صاف وشفاف آب وہوا کی طرح ہر چیز مصفا اور پاک تھی۔ ماحول میں کوئی آلودگی نہ تھی۔ دیہات کے لڑکے سکول جاتے ہوئے پگڈنڈیوں کو عبور کرتے، ندی نالوں میں پایاب چلتے، میوہ دار درختوں کی ٹہنیوں کو چھوتے ہوئے آگے بڑھتے۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ ناشپاتی، سیب، انگور اور انار بھی لاتے اور ماسٹر جی کی نظریں بچا کر ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ مل کر کھاتے۔

(بحوالہ مضمون میرا بچپن، میری یادیں)

غرض اس پاک وصاف اور فرحت بخش ماحول میں پرورش پانے والا یہ لڑکا ماہ و سال کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ایک پختہ کار قلمکار اور دانشور بن کر اُبھرا اور اس نے صحافت کی دنیا میں اپنا اور اپنے خاندان والوں کا نام روشن کیا۔ یہ قلم کا دھنی اپنے مصمم ارادوں اور غیر متزلزل قدموں کے سہارے آپ اپنی منزل کی طرف بے باکی سے

بڑھتا رہا اور وقت کی گھٹا ٹوپ آندھیوں اور اندھیروں کے سامنے سینہ سپر رہا۔ آپ نے اخبار نویسی کے پیشہ سے وابستہ ہو کر اپنے مشن کی آبیاری کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا موقر اخبار ''سرینگر ٹائمز'' عوام کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ یہ مرحوم صوفی غلام محمد کی دین ہے کہ آج بھی اُن کا جاری کردہ ''سرینگر ٹائمز'' عوام میں کافی مقبول ہے اور اُن کے برادر خورد جناب بشیر احمد بشیر اس کی ادارت کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

صوفی صاحب نے اپنے قلم کو نہ صرف اخبار اور صحافت تک محدود رکھا بلکہ آپ ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصنف بھی تھے۔ آپ نے 1962ء میں اپنے سات افسانوں پر مشتمل کتاب ''لوٗیمتی تارکھ'' اور دوسری کتاب بھی ''شیشہ تہ سنگستان'' تحریر کر کے ادبی اور علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل کی۔ ریاستی کلچرل اکاڈمی نے ان دونوں کتابوں کو انعامات سے نواز کر صوفی صاحب کی کاوشوں کی پذیرائی کی۔

صوفی غلام محمد مرحوم کی شخصیت گونا گوں صفات کی حامل تھی۔ جہاں وہ ایک فرض شناس صحافی تھے، وہاں وہ صاحبِ قلم اور باوصف ادیب بھی تھے۔ یہ صوفی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت ہی تھی کہ اُن کو خاص موقعوں کی مناسبت سے سجائی گئی علمی اور ادبی محافل میں مدعو کیا جاتا تھا اور وہ اکثر ایسی محفلوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ اپنے تجربات کی بنا پر وہ سامعین کے فکر و خیال پر چھائے رہتے تھے۔ راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب راولپنڈی پاکستان میں کشمیر کے ایک نامور فرزند اور صحافی جن کی ادارت میں ''کشمیر'' نام کا اخبار نکلتا ہے، یعنی عبدالصمد وانی نے غریب الوطنی کی حالت میں وہاں انتقال کیا تھا، تو سرینگر کے احدوز ہوٹل میں اِس سلسلے میں ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ جہاں بہت سارے اہل قلم اور اخبار نویس موجود تھے۔ اس تعزیتی میٹنگ میں جناب صوفی غلام محمد روحِ رواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے مرحوم عبدالصمد وانی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اثر آفرین انداز سے اپنا خراج عقیدت پیش کیا اور مرحوم کی بہت ساری

خدمات کو سراہا تھا۔ اسی طرح سرینگر کشمیر کے صدر ڈاک خانے (General Post Office) میں کئی سال قبل ملازمین یونین کی سالانہ کانفرنس تھی اور وہاں صوفی صاحب کو اعزازی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ دیگر مقررین کے بعد آخر پر بطور مہمانِ خصوصی جناب صوفی غلام محمد نے اپنے ذریں اور بصیرت آموز خطاب سے اجلاس میں بیٹھے سامعین کو بہت ہی محظوظ فرمایا تھا۔

صوفی غلام محمد کو جہاں اردو زبان وادب سے لگاؤ تھا وہاں انہوں نے اپنی مادری زبان یعنی کشمیری کی بھی بہت خدمت کی ہے۔ کشمیری میں ان کی طبع زاد کتابیں اِس پر شاہد ہیں۔ مرحوم نے 2004ء اور 2005ء میں کشمیری میں بھی کاشر سرینگر ٹائمز کا اجراء عمل میں لایا تھا اور اس کے کئی پندرہ روزہ شمارے بھی منظر عام پر آئے تھے۔ پھر یکا یک نامعلوم وجوہات کی وجہ سے یہ اخبار بند ہوگیا۔

ان کی مقبولیت کا راز اسی میں نظر آتا ہے کہ اُن کے انتقالِ پُر ملال پر غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی تھی اور بہت سے شیدائی آہیں بھرتے اور سسکیاں لیتے نظر آتے تھے۔ اُن کے صحافتی مقام ومرتبہ سے انکار ممکن نہیں۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ میر واعظ عمر فاروق نے پڑھائی جس میں ریاست کے اُس وقت کے وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ کے علاوہ گورنر این این ووہرا، نیشنل کانفرنس کے صدر، پی ڈی پی سرپرست، پردیش کانگریس صدر اور دیگر علاحدگی پسند لیڈران بھی شامل تھے۔ اس موقعہ پر صوفی صاحب کے مداحوں اور شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی موجود تھی جنہوں نے اشک بار آنکھوں سے وادیٔ کشمیر کے اس عظیم صحافی اور درخشندہ ستارے کو الوداع کیا۔
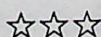
☆......رشید کانپوری

صوفی غلام محمد۔۔۔ایک پُرخلوص شخصیت

صوفی غلام محمد ڈلگیٹ سری نگر میں 1932ء میں پیدا ہوئے اور 1960 کے آس پاس کانگریس پارٹی کے اخبار ''خدمت'' سے وابستہ ہو کر صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ مابعد 1969ء میں اپنا نجی اخبار ''سرینگر ٹائمز'' شائع کیا۔ روزنامہ ''سرینگر ٹائمز'' جموں وکشمیر کے شہر و دیہات میں مقبول ہوا اور متواتر ہر گھر اور دفتر میں نہایت شوق و ذوق سے پڑھا جانے لگا۔ اِس اخبار کی یہ مقبولیت ہنوز قائم ہے۔ اس دوران صوفی صاحب کشمیر پریس کلب کے صدر بھی رہے اور کئی بار ''ڈیلی نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس'' کے ممبر بھی رہے۔ انہیں مفتی محمد سعید کے دورِ حکومت 2002 میں لجسلیٹو کونسل کا ممبر بھی نامزد کیا گیا اور 2006 تک اس عہدے پر رہے۔ اس دوران بھی انہوں نے جموں وکشمیر میں صحافت اور اردو وکشمیری زبانوں کی ترقی وترویج کے لئے کافی کام کیا۔

انہوں نے کئی بیرونی ممالک کا دورہ کیا جن میں روس، امریکہ، ایران، عراق، برطانیہ، سعودی عرب اور پانچ بار پاکستان کا دورہ بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کچھ سفرنامے بھی تحریر کئے ہیں۔ 1984ء میں انہوں نے اس وقت اپنا پہلا سفرنامہ لکھا جب پہلی بار پاکستان کا دورہ کر کے آئے اور یہ سفرنامہ قسط وار سرینگر ٹائمز میں چھپا بلکہ دوسرے سفرنامے بھی مختلف اوقات میں اسی اخبار میں چھپتے رہے۔ انہوں نے ''ہمالیہ سے پامیر تک'' اور ''ایرانِ صغیر سے ایرانِ کبیر'' تک عنوانات کے تحت دو اور سفرنامے 1988ء

میں دورۂ روس اور 1990ء میں دورۂ ایران کے سلسلے میں قلم بند کئے۔

جموں وکشمیر میں صحافت کے پیڑ کی پرورش اوراس کے جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں صوفی صاحب کا اہم کردار رہا ہے۔ انہوں نے اپنا اخبار سرینگر ٹائمز نہایت ہی مشکل حالات اور پُر آشوب دور میں جاری رکھا۔ صوفی صاحب اخبار نویسی کو ایک فن تصور کرتے تھے۔ وہ اخبار نویسی یا صحافت کسی بھی زبان کے لئے اہم مانتے تھے۔ چنانچہ ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''اخبار نویسی چھے باضأبطہ اَکہِ فنچہِ شکلہِ منز بڑ ؤنہہ پکان۔ فنہٕ کِس مأدأنس منز چھُ کانہہ چیز تیلہِ پۆ دتراوان ییلہِ سُہ ضۆ رورتکہِ حدٕ نبر۔ پرٕتھ کانہہ چیز یُس بناونہٕ آدٕتمیک اوس انسانس حاجتھ۔ سُہ حاجت ییلہِ دراو، اِدٕ پہو انسانس سُہ چیز زبرتہٕ مأرِ موٗنڈ بناوٕنک ظون۔ امہِ کتھہِ دُیث فنس زُو، صحافت یا اخبار نویسی چھے پرٕتھ زبأنی ہُندِ خأطرٕ اَکھ بڈٕ ضرورتھ روزٕمژ۔ گُنہِ زبأنی ہُندی رُت کانچھن وأکی چھِ نہٕ اَتھ ضرورتس ہبکان پَتھ کُن ترٕ اَوِتھ۔ کٲشیرِ ہُندی لۆکھ چھِ پنٕنہِ زبأنی منز اخبار کڈنہٕ خأطرٕ سخ کریشان۔ ییلہٕ اَسی عام لۆکن ریڈیوہس پیٹھ کأشرِ خبرٕ بوزنہٕ خأطرٕ یۆ ہے آنتہٕ ہیوٚ ٕمتی دُچھان چھِ اِدٕ چھُ فکرِ تران تِمن کأژاہ چھے پنٕنہِ زبأنی ہُنز گار۔''

(مضمون کأشرس منز صحافت، سون ادب 1976ء ص:۳۸۶)

انہوں نے کشمیری زبان میں نہایت ہی خوبصورت افسانے لکھے۔ انہوں نے اپنے دو افسانوی مجموعے ''شیشہ تہٕ سنگستان'' اور ''لۆ ٕمتی تارکھ'' شائع کئے اور ان دونوں مجموعوں کی اہمیت اور معیار مدنظر رکھتے ہوئے انہیں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی جانب سے بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا۔ صوفی صاحب عمر بھر اردو زبان کی آبیاری اپنے اخبار اور دیگر نگارشات سے کرتے رہے۔ ان کی تحریروں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت بیانی سے کام

لیتے تھے۔ وہ بذاتِ خود ہر ایک خبر پر غور کرتے تھے اور کبھی کبھی مشاہدہ کرتے کرتے حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے فون پر متعلقہ فرد یا ایجنسی کے ساتھ رابطہ کرتے تھے اور کنفرم کرنے کے بعد ضبطِ تحریر میں لاتے تھے۔ جس سے اُن کے اخبار کا وقار بڑھتا گیا اور اخبار بھی ترقی پاتا رہا۔ انہوں نے اپنے مضامین میں فکر و نظر کی بالیدگی سے تازگی اور توانائی عطا کی ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں ان ممالک کے کھانے پینے، تہذیب و تمدن اور کلچر وغیرہ کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جن کا انہوں نے سفر کیا۔ اس طرح سے انہوں نے ایک صحافی کا بھی فریضہ انجام دیا ہے اور ایک مورخ کا بھی۔

صوفی غلام محمد کشمیر کے بلند پایہ صحافیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اس وقت سرینگر سے اخبار شائع کیا جب کشمیر کی صحافت گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اور انہیں کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ کشمیری زبان گھروں سے باہر آرہی تھی۔ ریڈیو میں داستان گوئی، مثنوی نگاری اور دیگر کلچر سے وابستہ چیزیں آہستہ آہستہ کم ہو رہیں تھیں۔ اس زمانے میں پریس کی آزادی نہ ہونے کے برابر تھی اور حکومتِ وقت اخبار شائع کرنے پر پابندی عائد کرتی تھی۔ یہ صوفی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج کل وادی سے مختلف زبانوں میں درجنوں روزنامے اور ہفتہ وار وغیرہ اخبار اور ماہنامے شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت جو صحافت کا سورج وادیٔ کشمیر میں چمک رہا ہے اس کا سہرا صوفی غلام محمد کے سر جاتا ہے۔ وہ زبان کی ترقی کی خاطر کام کرنے کو عبادت سمجھتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ صوفی صاحب صبح گیارہ بارہ بجے دفتر سرینگر ٹائمز واقع بڈشاہ چوک سرینگر آتے تھے دن بھر کام کرتے تھے اور اپنی نگرانی میں اخبار پریس کو ارسال کرتے تھے۔ اخبار کے علاوہ اور کام بھی اردو و کشمیری ادب کے حوالے سے کرتے رہتے تھے۔

صوفی غلام محمد نہ صرف بلند پایہ صحافی اور قلمکار ہی تھے بلکہ خداترس انسان بھی تھے۔ انکساری، شرافت اور نفاست پسندی میں ان کا ثانی نہ تھا۔ نرم مزاجی اور نرم گفتاری اُن کا شیوہ تھا۔ عدل و انصاف میں آگے آگے تھے اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔ وہ کسی کے دل کو ٹھیس

یا تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے بلکہ محتاجوں اور غریبوں کی ہر طرح سے بھر پور مدد کرتے تھے۔
مجھے 89-1988ء کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میں صوفی صاحب کو کم ہی جانتا تھا۔ میری تعیناتی پولیس سٹیشن مائسمہ میں تھی کہ ایک روز دن کے گیارہ بجے کے قریب جب میں گشت پر تھا، تھانہ کے منشی نے بذریعہ وائرلیس صوفی صاحب کے تھانے میں آنے کی اطلاع دی۔ میں جلدی جلدی تھانے پہنچا اور صوفی صاحب ایس ایچ او کے دفتر میں تشریف رکھے ہوئے تھے اور کافی مغموم موڑ میں تھے۔ میں دفتر میں داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد وارِدِ تھانہ ہونے کا سبب معلوم کیا تو کہا کہ ہمارے پریس واقع شیخ باغ لالچوک میں چوری ہوئی ہے چوروں نے پریس کی مشینوں کے کچھ اہم پُرزے اڑا لئے ہیں۔ اگر یہ پُرزے برآمد نہ ہوئے تو پریس کا چلنا ناممکن ہے اور اخبار بھی نہیں چھپ سکتا ہے۔ صوفی صاحب نے میری طرف ایک کاغذ بڑھایا جس میں چوری کی واردات کی پوری کہانی تحریر تھی۔ میں نے اُن کو اس یقین دہانی کے بعد تھانہ سے رخصت کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جلد از جلد کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔ میں نے شام کے رول کال میں تھانے میں حاضر تمام ملازمین کو بُلا کر اس واقعہ کی نسبت ہدایات دیں اور اس رات خود نائیٹ گشت کی نگرانی کا ایک دستہ لے کر لالچوک پہنچا اور ہمراہئیوں کو نکڑ اور اہم گلیوں پر تعینات کیا اور خود بنڈ اور شیخ باغ روڑ کے دائیں بائیں چکر کاٹتا رہا۔ رات کے تقریباً بارہ بجے شیخ باغ گلی کے عقب والے علاقہ سے تین لڑکے ایک بوری میں کچھ سامان لیتے ہوئے پکڑ لئے۔ اس بوری میں مشینوں کے کچھ کل پُرزے تھے۔ لڑکوں کو تھانے لایا گیا اور پوچھ تاچھ کے دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ یہ کل پرزے سرینگر ٹائمز کے پریس سے چرائے گئے ہیں۔ ان چوروں کی نشاندہی پر پریس کا دوسرا اسی قسم کا چُرایا گیا سامان بھی برآمد ہوا۔

دوسرے روز صبح کے دس بجے تک پورا سرقہ شدہ مال برآمد ہو چکا تھا اور میں نے گیارہ بجے کے قریب صوفی صاحب کو برآمدگی کے بارے بذریعہ ٹیلیفون مطلع کیا اور تھانے میں تشریف لانے کی استدعا کی۔ صوفی صاحب یہ خبر سُن کر بہت خوش ہوئے اور چند ہی منٹوں کے بعد تھانے آئے اور مال مسروقہ کی شناخت کی اور چوروں کو دیکھنے کیلئے کہا۔

جب چور اُن کے سامنے لائے گئے جن کی عمر ۱۲ سے ۱۴ سال تک کی تھی کچھ دیر ان کے ساتھ بات چیت کی۔ مابعد مجھے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرنے کی منت سماجت یہ کہہ کر کی کہ یہ چھوٹے بچے ہیں اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں سدھرنے کا ایک موقعہ دیں اور یہ سدھر کر کل کے عزت والے شہری بنیں گے۔ اب اگر ایک بار انہوں نے جیل کی ہوا کھائی اور پولیس کا ڈر ان کے دلوں سے نکل گیا تو یہ چور اور بُرے انسان بنیں گے اور خدا اس عمل کو آپ کی نیکیوں میں شمار کرے گا۔ اگر آپ انہیں سدھرنے کا موقع دیں گے۔

مرحوم سرینگر کی ہر ایک ادبی تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ میری آخری ملاقات اُن کے ساتھ انتقال سے قبل تقریباً پانچ ماہ اس وقت ہوئی جب جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے سنٹرل ہال میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی تھی اور صوفی صاحب نے اس تقریب کی صدارت کی تھی۔

☆...... سید علی صفوی
(کشمیری سے ترجمہ: سید مبشر رفاعی)

صوفی غلام محمد۔۔ نڈر صحافی اور دلچسپ شخصیت

کشمیر نے روزنامہ سرینگر ٹائمنر کے مدیر، صوفی غلام محمد کی صورت میں بے باک صحافت کے بانی اور شہرت یافتہ اردو قلمکار کو کھو دیا ہے، تاہم ان کی یادیں ہمیشہ سب کے اذہان میں تازہ رہیں گی۔

کشمیر یونیورسٹی کے مرکز برائے سینٹرل ایشین سٹڈیز کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر کے این پنڈتا کا ماننا ہے، ''صوفی صاحب اپنے آپ میں ایک انجمن تھے اور انہوں نے غیر جانبدارانہ و منصفانہ صحافت کی داغ بیل ڈالی''۔

وہ مزید کہتے ہیں، ''بحیثیت انسان وہ شائستہ مزاج، بامروّت، انسانیت کے قدر داں تھے۔ان کے انتقال سے کشمیریوں کو کافی ادبی نقصان پہنچا ہے۔''

صوفی صاحب نے اپنے قلم کو اس طرح اپنے قابو میں رکھا کہ جس طرح ڈارتھ واڈر نے اپنی تلوار کو رکھا تھا اور ایک عام آدمی کے کاز کی پانچ دہائیوں تک ترجمانی کرتے رہے۔صحافت ان کا شوق تھا اور یہ جنون ان کے رگ و پے میں تھا۔وہ تب تک اپنے شوق

کے ساتھ جڑے رہے جب تک کہ موت نے ان کا قلم ہمیشہ کیلئے ان سے چھین لیا۔

بڑے پیمانے پر پڑھے جانے والے اپنے کالموں اور بے باک اداریوں کے ذریعے انہوں نے سرکاری اداروں کو ہلا کر رکھ دیا۔

صوفی صاحب ایک راست آدمی تھے جن میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر صاف گوئی سے کام لینے کی ہمت تھی۔ انہیں 2002ء میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید نے قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا، تاہم اس سے مفتی صاحب کے کچھ با اثر وزارتی ساتھیوں کی تنبیہہ کرنے میں انہیں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔

ایک برطانوی عالمی تجارتی اخبار "فائنانشل ٹائمز" کے نامہ نگار سمیر بھٹ کہتے ہیں، "ان (صوفی صاحب) کی ذکاوت ریاست کی سیاسی تبدیلیوں کو سمجھنے، شخصیات اور انسانی کرداروں کا مطالعہ کرنے اور کشمیری و اردو زبانوں پر فنکارانہ مہارت میں پوشیدہ تھی۔" وہ کہتے ہیں، "میرے خیال میں انہیں آخری باکمال مدیر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہے گا۔ انہیں کشمیری زبان پر بھی ملکہ حاصل تھا۔"

لندن سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے "کشمیر افیئرس" کے مدیر مرتضیٰ شبلی کا کہنا ہے، "کشمیری قلم کار کی حیثیت سے میں نے انہیں سادہ اور حیران کن پایا ہے۔ وہ عام مسائل کو اجاگر کرنے کیلئے عام محاوروں کو استعمال میں لاتے تھے۔ ان کی ذات کے اندر کچھ تھا۔"

وہ مزید کہتے ہیں، "میں ان (صوفی صاحب) کو برسوں سے جانتا تھا، کیونکہ وہ پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے میری تخلیقات کی ستائش کی اور ان کو اس وقت شائع کیا جب میں فقط پندرہ برس کا تھا۔ میں ان کے فراہم کردہ پلیٹ فارم اور بعد ازاں "چٹان" کا مشکور ہوں۔ اگرچہ بعد میں مجھے ان کے ساتھ کافی اختلاف رائے رہا، تاہم اس سے ہمارے رشتے پر کوئی آنچ نہیں آئی اور یہ رشتہ ہمیشہ قابل قدر رہا۔"

صوفی صاحب نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں "لوٚتٕ تارکھ" اور "شیشہ تہ

سنگستان'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کو کلچرل اکیڈیمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انہوں نے ایک اور کتاب کی تصنیف تقریباً مکمل کی تھی۔

بی بی سی اردو سروس میں پرڈیوسر کی حیثیت سے کام کر چکی سینئر کشمیری صحافی نعیمہ احمد مہجور کہتی ہیں:

''اگست کا آخری ہفتہ تھا جب میں ان سے، ان کی رہائش گاہ پر ملی۔ میں کشمیر کے تعلق سے لکھا اپنا ناول ان کو دکھانا چاہتی تھی، لیکن جب انہوں نے مجھے دیکھا تو انہوں نے اپنی ساری الماریاں کھولیں اور اپنے تحریر کردہ نسخے اور تصویریں نکالیں۔ میں نے پوچھا، یہ سب کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ میری کتاب ہے جو تمہارے ناول سے پہلے منظر عام پر آئے گی۔ انہوں نے کئی صفحے پڑھ کر مجھے سنائے اور شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اپنی نشستوں کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے انتہائی شوق کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے مجھے اپنی نایاب تصویریں دکھائیں اور میں اپنی تصویر دیکھ کر حیران ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں ابھی تک کمیاب نہیں ہوئی ہوں، میری تصویر کیوں کر رکھی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم میری بیٹی جیسی اور ایک اچھی دوست ہو، اسی لئے تمہاری تصویر نایاب تصویروں کے ساتھ رکھی ہے۔''

نعیمہ مزید کہتی ہیں:

''جو کچھ انہوں نے پڑھ کر مجھے سنایا، اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کشمیری تہذیب، اقدار اور روایات کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے کتاب کی رسم رونمائی کی تقریب میں شرکت کا مجھ سے وعدہ لیا۔ یہ کچھ عجیب لگ رہا تھا، کیونکہ میں انہیں اپنی کتاب دکھانا چاہتی تھی۔ جب وہ دو گھنٹوں تک بولتے

رہے تو میں ان سے رخصت لیتے ہوئے بولی کہ آپ نے میری دستاویز نہیں دیکھی۔ وہ ہنس پڑے اور بولے کہ تمہارے پاس لکھنے کیلئے بہت وقت ہے اور میرے پاس اب بہت کم وقت بچا ہے۔ جب میں نے پہلے باب میں کچھ ترامیم کی تجویز دی تو وہ کافی خوش اور مطمئن نظر آئے۔ مجھے نہیں پتہ کہ انہوں نے وہ کتاب مکمل کی یا نہیں تاہم مجھے امید ہے کہ ان کے ورثا ان کی یہ خواہش پوری کریں گے جو کہ ان کا ایک خواب تھا۔"

مرتضیٰ شبلی مانتے ہیں کہ صوفی صاحب نے کشمیر میں صحافت پر حکمرانوں کی پکڑ کا توڑ کیا۔ وہ کہتے ہیں، "صحافی کی حیثیت سے ان کی کشمکش اور بعد میں اپنا اخبار متعارف کرنے سے کشمیر میں صحافت پر حکمرانوں کی پکڑ کمزور ہوگئی۔ اگر چہ انہیں کہیں کہیں حالات کے ساتھ سمجھوتہ بھی کرنا پڑا، مگر میں مانتا ہوں کہ یہی زندگی ہے۔"

The Fiction of Nationality in an Era of Trans-nationalism کی مصنفہ ڈاکٹر نائیلہ علی خان" کہتی ہیں صوفی صاحب نوجوان صحافیوں اور قلم کاروں کیلئے ہمیشہ ایک مثال کی مانند رہیں گے۔"

وہ کہتی ہیں، "صوفی غلام محمد صاحب سالمیت کے معتبر صحافی تھے۔ انہوں نے متنوع آوازوں اور تجاویز کو ایک ایسی زبان اور طرح دینے کا ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا جس سے الجھے ہوئے سیاسی، تمدنی اور سماجی معاملات تک عام آدمی کی رسائی ممکن ہوئی۔ ان کا کام ترقی پسندانہ تھا۔ وہ اپنے قارئین تک فقط اطلاعات نہیں پہنچاتے تھے بلکہ انہیں پنپنے والی رائے قائم کرنے کا موقعہ بھی فراہم کرتے تھے۔ صوفی صاحب کی بلند آواز نے سرکاری اداروں کو ہلا دیا، خاص کر 90 کی تاریک دہائی میں جب معقول آوازوں کو بے عزتی کے ساتھ دبایا جاتا تھا۔"

صوفی صاحب نے کانگریس کے ترجمان 'خدمت' کے نامہ نگار کی حیثیت سے

اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا۔انہوں نے 1960ء کے آغاز میں ''سرینگر ٹائمز'' کی داغ بیل ڈالی۔انہوں نے مختلف اوقات میں کشمیر پریس کلب اور ڈیلی نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔

پنڈتا کہتے ہیں،

''چند سال قبل لندن میں میری ملاقات صوفی صاحب کے ساتھ ہوئی۔ہم ایک سمینار میں شرکت کر رہے تھے جس کا اہتمام انٹر نیشنل کشمیر ایسوسیشن نے کیا تھا۔اتفاق سے وہ اور میں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ان کے ساتھ گزارے وہ لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے۔وہ احتیاط کے ساتھ الفاظ کا استعمال کرتے اور سنجیدگی کے ساتھ کلام کیا کرتے تھے۔''

''انہیں بی بی سی اردو سروس سے کال موصول ہوئی۔معروف کشمیری اناونسر نعیمہ مہجور لائن پر تھیں۔نعیمہ نے انہیں انٹرویو کی دعوت دی۔صوفی صاحب نے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے ریڈیو انٹرویو کے تئیں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ کشمیر مسئلے کے تعلق سے ان کے خیالات کی عکاسی ان کے اخبار میں ہوتی رہتی ہے۔تاہم نعیمہ کے اصرار پر وہ مان گئے اور بش ہاوس گئے۔مجھے جینوا کی پرواز لینی تھی لہٰذا میں ان کا یہ انٹرویو سن نہ سکا۔''

''سمینار میں ہر کسی نے گہری توجہ کے ساتھ ان کی تقریر سنی۔ہر شخص نے ان کی رائے کی قدر کی۔وہ آہستہ اور آرام سے بولے۔انہوں نے مطلب کی بات کہی۔انہوں نے کسی بھی طرح کے جذبات کا اظہار نہیں کیا جیسا کہ کشمیر کے بارے میں بولتے ہوئے اکثر مقررین کرتے ہیں بلکہ ان کی تقریر اعتدال پسند، عملی اور معقول

تھی۔انہوں نے عمومی بات کہی، جیسا کہ ایک ہوشیار صحافی اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریاں نبھاتے وقت کرتا ہے۔''

ایک واقعہ سناتے ہوئے پنڈتا کہتے ہیں، ''ایک صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے۔ سیمنار میں شرکت کیلئے ہندوستان سے آئے درجن بھر افراد ایک میز کے ارد گرد بیٹھے تھے۔پینتھرس پارٹی کے پروفیسر بھیم سنگھ بھی وہیں تھے۔ان کے وفد میں سے ایک خاتون آئیں اور صوفی صاحب سے سیمنار کے بارے میں اپنی رائے دینے کو کہا۔وہ صوفی صاحب کی بات کو غور سے سننا چاہتی تھی۔لیکن صوفی صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ہمیں لگا کہ انہوں نے یہ سب فقط اس کو ٹالنے کیلئے کیا۔جب وہ خاتون چلی گئی تو کسی نے صوفی صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے خاتون کے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔صوفی صاحب نے کہا،'ارے بھائی نہ اس کا کوئی اخبار ہے، نہ کوئی میڈیا آوٹ لیٹ ہے، نہ پریس سے کوئی لین دین ہے۔میں کیا رائے اس کو دوں۔'ہم سب نے قہقہہ لگایا۔''

ممتاز تاریخ دان اور مصنف پروفیسر فدا محمد حسنین کا کہنا ہے کہ ایک بار وہ آکسفرڈ لائبریری گئے اور وہاں سرینگر ٹائمز کی فائلیں دیکھیں۔

وہ کہتے ہیں، ''آکسفرڈ یونیورسٹی لائبریری کے سربراہ نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس کشمیر کے بارے میں سب کچھ ہے۔میں نے مہجور کا نام لیا اور پلک جھپکتے ہی ترانہ مہجور وغیرہ کی فہرست آئی۔پھر میں نے 'صوفی غلام محمد مدیر' لکھا۔ان کے اخبار کی ایک خاص مدت تک کی فائلوں کی معلومات ملیں۔مجھے اب یاد نہیں ہے لیکن سربراہ نے مجھے بتایا کہ مابعد اخبار کی فائلیں سویڈن میں ایک ایجنسی کے پاس محفوظ ہیں۔''

وہ مزید کہتے ہیں، ''وہ میرے اچھے دوست تھے۔ان کی دوستی کا ایک خاصہ یہ تھا کہ وہ دوست بدلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔وہ جس کو دوست کہتے وہ کمیوں کے باوجود بھی ان کا دوست بنا رہتا۔آرکائیوز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے میں نے کئی مضامین لکھے جو انہوں نے شائع کئے۔1970ء کے بعد انہوں نے جرمنی، جاپان اور سویڈن کے میرے

سفرناموں کو شائع کیا۔"

حسنین کا مزید کہنا ہے، "سرکاری کیریئر کے دوران کچھ ٹکراؤ پیدا ہوا۔ کسی نے میرے خلاف لکھا اور اپنا خط ان کو بھیج دیا۔ صوفی صاحب نے میرے خلاف کچھ بھی شائع نہیں کیا اور مجھے وہ خط بھیج کر کہا کہ میں ان کا دوست ہوں اور وہ میرے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کریں گے۔"

ماضی میں کئی ایسی شخصیات گزری ہیں جنہوں نے تاریخ کے اوراق پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور حق کے متلاشیوں کیلئے رہنماؤں کی حیثیت سے وقت کے اندھیروں کے بیچوں بیچ انسانیت کی شمع فروزاں رکھی۔ صوفی صاحب کو ایسی شخصیات کی فہرست میں رکھا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

☆☆☆
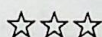
☆ اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆...... ڈاکٹر مجید

صوفی غلام محمد۔۔۔
چند یادگار ملاقاتیں

جموں کشمیر میں جن ادیبوں، شاعروں، مصنفوں اور صحافیوں نے اردو زبان کوفروغ دیا اور اپنی خدمات سے مالا مال کیا ہے اُن کی ایک طویل فہرست ہے جن کے نام یہاں گِننا ناممکن نہیں لیکن وادی کشمیر کے بیشتر صحافیوں نے اپنی زیادہ تر عمر اسی زبان کی خدمات میں گزاری اُن میں ایک نام مرحوم غلام محمد صوفی کا بھی ہے۔صوفی صاحب آج ہمارے درمیان نہیں تاہم اُن کے ساتھ لاکھ اختلافات سہی مگر صحافتی شعبہ میں رہ کر انہوں نے اُردو کیلئے جو کام کیا ہے وہ نہ صرف ہمیشہ یاد رکھا جائے گا بلکہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے کیونکہ کشمیر میں اُردو صحافت ہمیشہ آزمائشوں سے دوچار رہی ہے اور یہاں کے اُردو صحافیوں نے تلوار کی دھار پر چل کر اس شمع کو تا حال فروزاں رکھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں سری نگر ٹائمز سے وابستہ ہوا تو مجھے اس کے صفحہ نمبر 2 اور 3 کے ساتھ وابستہ دفتری عملے کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ابھی چند روز ہی مجھے یہاں کام کرتے ہوئے گزرے تھے کہ صوفی صاحب نے ایک بار اپنے آفس چیمبر میں طلب کیا۔میں گھبرایا ہوا ان کے آفس میں گیا اور جب اپنا تعارف کرایا

تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اُن کے چہرے پر میں نے جو ہلکی سی مُسکراہٹ دیکھی تو میں سمجھ گیا کہ شاید میری عارضی نوکری پکی ہوئی ہے۔ انہوں نے مجھے کُرسی پر بیٹھے کا اشارہ کیا۔ وہ شاید اداریہ لکھنے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور مجھ سے خیر و عافیت دریافت کی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ شاید بشیر احمد بشیر نے اُن کے ساتھ میرے متعلق بات کی تھی یا وہ میرا کام دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے جو پیشہ ورانہ صحافت سے متعلق بات مجھ سے کہی وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ انہوں نے کہا ''صحافت عداوت کے مترادف بن چکی ہے۔'' یہ سُن کر میں حیران ہوا کہ یہ صوفی صاحب نے کیا کہا؟ میں تو خاموش ہی رہا۔ میں نے سوچا اتنے بڑے صحافی ہیں کوئی بات ہوا میں نہیں کہیں گے۔ میں نے جرأت کر کے ان سے سوال کیا؟ صوفی صاحب، میں سمجھا نہیں۔ تو کہا کہ اگر آپ کو سچائی عوام تک پہنچانی ہے اور صحافتی ذمہ داری نبھانی ہے تو اُس شخص سے سچائی اُگلوانی ضروری ہے جس نے غلط کام کیا ہو یا سماج کو نقصان سے دوچار کیا ہو یا اپنے فرائض منصبی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہو یا انتظامیہ میں رہ کر بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہو یا حکمران بن کر عدل و انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ ایسے افراد کے ساتھ عداوت ہونی چاہئے تاکہ آپ اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر سکیں اور اپنے پیشہ کے ساتھ انصاف بھی۔ یقین مانئے جس وقت میں صوفی صاحب کے سامنے بیٹھا تھا اُس سے قبل میں نے روزنامہ ''وادی کی آواز'' میں غلام نبی شیدا کے ساتھ کام کیا تھا۔ کرنٹ نیوز ایجنسی اور پریس بیورو آف انڈیا نامی مقامی خبر رساں اداروں میں تجربہ حاصل کیا تھا لیکن صوفی صاحب کی یہ باتیں میرے ذہن کو کسی اور ہی جانب کھینچ لائیں۔ انہوں نے میرے ساتھ اگرچہ چند اور باتیں کیں جن میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ روزنامہ سرینگر ٹائمز ایک ایسا ادارہ ہے جہاں اُردو صحافتی خدمات کے ساتھ ساتھ اس زبان کی خدمت کرنا ایک مشن سمجھا جاتا ہے۔ آج تک ان کی نصیحتیں میرے ذہن کو تازگی عطا کر رہی ہیں۔

ان کے ادارے میں رہ کر مجھے صوفی صاحب کے کام کرنے کے طریقہ کار کے رموز واسرار کا ادراک ہوا۔ جیسے کہ وہ رات کے دو بجے روزنامہ سرینگر ٹائمنر کا صفحہ اوّل مکمل کرتے تھے۔ اداریہ لکھنے کے بعد اس کی پروف ریڈنگ کرتے تھے۔ وہ یہ کام بالکل خاموشی کے ساتھ انجام دینے کے قائل تھے۔ صفحہ ہذا کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھتے اور درُست الفاظ کا استعمال اور چُن چُن کر جملوں اور لفظیات کا استعمال کرتے تھے۔ ظاہر ہے ان کا شمار کشمیر کے عظیم صحافیوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا حق ادا کرتے رہے۔ اُنہیں Ethics of Journalsim کا بھی احساس تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ زرد صحافت کیا ہے۔ لیکن اردو زبان کا وہ کس قدر لحاظ رکھتے تھے۔ وہ اُردو زبان سے وابستہ قارئین بخوبی جانتے ہیں۔ آج کشمیر کا اُردو حلقہ ان کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ کشمیر میں اُردو اخبارات کا اس وقت کیا حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے اداریئے جاندار، معلومات سے پُر، تواریخی شواہد سے بھرے اور صحافتی اصولوں کی کسوٹی پر کھرا اُترتے تھے۔ ان کی اخباری سُرخیاں اس قدر معنی خیز اور فکر انگیز ہوتی تھیں کہ انسان گہری سوچ میں پڑتا تھا اور اگلے روز ان کا اخبار سرینگر ٹائمنر کا مطالعہ کرنے کی چاہت تڑپاتی تھی۔ چونکہ صوفی صاحب سیاست کا حصہ بنے مگر متحرک سیاست میں حصہ نہیں لیا تاہم بحیثیت صحافی اور ادیب جو کام انہوں نے انجام دیا وہ بے مثال اور منفرد ہے۔ انہوں نے اُردو صحافت کے ساتھ انصاف کیا ہے جس کی نئی نسل کو تقلید کرنی چاہئے اور اُن کے نقوش پر عمل پیرا ہو کر اُردو زبان کا محبّ بننا چاہیئے۔

☆...... قاسم سجاد

صوفی غلام محمد ۔۔۔ صحافتی دنیا کا بادشاہ

یہ اس دور کی بات ہے جب منصۂ شہود پر چند ہی اخبارات یعنی روزنامہ آفتاب، روزنامہ خدمت، روزنامہ ہمدرد، روزنامہ مارتنڈ مارکیٹ میں نظر آتے تھے۔ غالباً صوفی غلام محمد "خدمت" اخبار جو روزنامہ چھپتا تھا، کے ادارتی عملے کے ساتھ وابستہ تھے اور اخبار خدمت کا کشمیری ایڈیشن جو ہر اتوار کو چھپتا تھا، یہ صوفی غلام محمد کی ہی سربراہی میں ترتیب پاتا تھا۔ اس زمانے میں صوفی صاحب کشمیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں ایک ادیب کے طور پر جانے جاتے تھے۔ یہ ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اخبار "خدمت" جو جموں و کشمیر کانگریس پارٹی کا ترجمان مانا جاتا تھا، مدرسوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں آتا تھا۔ ایک روز میں نے اننت ناگ کے سینٹرل سکول کی لائبریری میں "خدمت" کا ادبی ایڈیشن دیکھا، جو صوفی صاحب نے ہی ترتیب دیا تھا اور اس ایڈیشن میں صوفی صاحب کا ایک افسانہ بھی پڑھنے کو ملا تھا۔ اس طرح صوفی صاحب کے کشمیری ادب کے ساتھ گہری وابستگی کا پتہ چلا۔ صوفی صاحب نے اسی دوران یعنی ۴۸ رسال پہلے "سرینگر ٹائمز" ہفت روزہ اخبار کے طور پر سرینگر سے شروع کیا۔ لیکن ان دنوں اخبار آفتاب جو خواجہ ثناء اللہ بٹ مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، عوام کا محبوب اخبار تھا اور کشمیر کے اس وقت کے قلمکار آفتاب کے ذریعہ اپنی تخلیقات منظرِ عام پر لاتے تھے لیکن سرینگر ٹائمز چونکہ صوفی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے لگا اور صوفی

صاحب کو اخبار نویسی کا جو تجربہ دوسرے اخبارات میں کام کرنے سے حاصل ہوا تھا اس کا بھرپور اظہار ہونے لگا اور سرینگر ٹائمز قارئین کے ہاتھوں میں آنے لگا اور بہت کم وقت میں اخبار کو عوامی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوگئی اور یہ روزنامہ بن گیا۔ یوں صوفی صاحب کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا اور سرینگر ٹائمز بہت کم وقت میں روزنامہ آفتاب کا ہم پلہ اخبار بن گیا۔ ستّر کی دہائی میں سرینگر ٹائمز کو سرینگر کے سینٹرل جیل میں جہاں ہم قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے، پڑھنے کو ملتا تھا۔ سرینگر ٹائمز کارٹون کی وجہ سے عوامی اخبار بن گیا۔ بشیر احمد بشیر کو ریاست میں صفِ اوّل کا کارٹونسٹ مانا جاتا ہے۔ اِن کے دلچسپ اور سبق آموز کارٹون نے اخبار سرینگر ٹائمز کو ریاست کے طول و عرض میں بہت مقبول بنایا۔ سرینگر ٹائمز کا مشہور مزاحیہ کالم ''شرارے'' قارئین کو پڑھنے کا سامان فراہم کرتا تھا اور صوفی صاحب کی زندگی تک ''شرارے'' کافی پسندیدہ کالم شمار ہوتا تھا۔

کشمیر کے ادبی اور علمی سماج میں اخبارات کے رول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے اور ان سرکردہ صحافیوں جیسے مولانا مسعودی، پریم ناتھ بزاز، شمیم احمد شمیم، خواجہ ثناء اللہ بٹ کے پائے کے صحافیوں کے ہم پلہ ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن صوفی غلام محمد بہت کم وقت میں متذکرہ صحافیوں کی صف میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اپنے اخبار کو عوام کا اخبار بنانے میں ایک کامیاب ہوگئے۔ زبان و ادب پر دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ محنت کے اچھے ثمرات سے صوفی صاحب کے پورے خاندان کو کشمیر کی علمی دنیا میں ایک مقام حاصل ہوگیا۔ صوفی صاحب کے برادر محترم مرحوم صوفی محی الدین جو اپنے زورِ قلم کے سبب سرینگر ٹائمز کے روحِ رواں سمجھے جاتے تھے، نے بھی اپنے برادر کا ہاتھ بٹا کر سرینگر ٹائمز کو کامیاب اخباروں کے کارواں میں شامل کیا۔

صوفی صاحب کے ساتھ ستّر کی دہائی میں بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور میں اپنا مضمون لے کر ان کے پاس جاتا تھا جہاں وہ میرے مضمون کو پسند تو ضرور کرتے تھے لیکن اخبار کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں درجنوں دشواریوں کا بھی ذکر کرتے تھے۔ جنوبی کشمیر

کے سیاستدانوں پر مجھے ایک روز لکھنے کی فرمائش کی اور میں نے ''کئی رہنماؤں کے چہرے'' نام کا کالم لکھنا جب شروع کیا اور سیاست دانوں کے اصلی چہروں کو دکھانے کی کوشش کی۔ صوفی صاحب نے ایک رہنما کے بارے میں لکھے ہوئے خاکے کو جب پڑھا لیکن شائع کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ میں بہت دیر تک ''اننت ناگ کے لیل ونہار'' نام کی پولیٹکل ڈائری لکھتا رہا اور یہ مسلسل کئی سال تک سرینگر ٹائمنر میں چھپتی رہی۔ صوفی صاحب کا سرینگر ٹائمنر اننت ناگ کے طول وعرض میں پہنچانے کا سہرا یہاں کے معروف اخباری ہاکر محمد امین خان کے سر جاتا ہے۔ خان مرحوم نے انتہائی محنت سے سرینگر ٹائمنر کو ڈسٹرکٹ اننت ناگ کے گھر گھر پہنچانے میں غیر معمولی محنت کا مظاہرہ کیا۔ صوفی صاحب سے یہاں بھی بار بار ملاقاتیں ہوئیں، وہ اپنے صحافتی سفر کے اہم واقعات کو بیان کرنے میں بڑا افسوس کرتے تھے۔ ۸۰ر کی دہائی میں مرحوم صوفی صاحب نے پاکستان کا طویل دورہ کیا اور اپنے پاکستان کے سفرنامے کو قسطوں میں اخبار میں شائع کرتے رہے۔

''سرینگر ٹائمنر'' کے اداریئے بڑے شوق سے ان دنوں بھی پڑھے جاتے تھے اور آج تک وہ اداریئے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ صوفی غلام محمد صحافت کے رموز سے اس قدر واقف تھے کہ ایک روز ریڈیو کشمیر کے پروگرام میں وہ ''کشمیر میں صحافت کے روشن امکانات'' پر گفتگو کر رہے تھے اور جن لوگوں نے صوفی صاحب کی یہ گفتگو سنی، ان سب نے یہ کہا کہ صوفی صاحب واقعی اور معیاری اور باخبر صحافی ہیں۔ اگرچہ محفل میں خواجہ ثناءاللہ بٹ مرحوم بھی شریک تھے اور کمال احمد صدیقی جو اس محفل کیلئے ریڈیو کی نمائندگی کر رہے تھے، نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ صوفی غلام محمد ایک طاقتور صحافی کے طور پر نمائندگی کرنے کے اہل صحافی ہیں۔

صوفی صاحب کو ریاستی قانون ساز کونسل کا رکن بننے کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔ مجھے سول سیکریٹریٹ میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کونسل کا ممبر بننے پر وہ مجھ سے مبارک بادی کی امید رکھتے تھے لیکن میں نے صوفی صاحب سے کہا کہ آپ ایک استاد صحافی ہیں اور

آپ کا قد پوری صحافتی دنیا میں اونچا ہے۔ کیا قانون ساز کونسل کا رکن بننے سے آپ کے صحافتی قد میں فرق تو نہیں آیئے گا؟۔

صوفی صاحب اپنا دفاع کرتے ہوئے کہنے لگے کہ قانون ساز کونسل ہم جیسے لوگوں کا ہی ادارہ ہے۔ یہاں اس کونسل میں سیاسی گماشتوں کے بجائے اہل علم وقلم کا ہونا ہی کونسل کے معیار کا تقاضا کرتا ہے۔ کونسل کے رکن کے طور پر صوفی صاحب نے صحافتی دنیا کی نمائندگی نہیں کی۔ انہوں نے کشمیر میں اردو زبان کے فروغ کیلئے ایک مسودّہ قرارداد پیش کی۔

بہر حال! صوفی غلام محمد کو ایک دیدہ ور صحافی کے طور پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آخر وہ مرحلہ آ ہی گیا جب صوفی صاحب موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے اور عجیب اتفاق ہے کہ کشمیر کے ہم سفر دو سر کردہ صحافی ایک ہی وقت سرینگر صورہ ہسپتال میں صاحب فراش ہو گئے اور دونوں حضرات داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ صوفی صاحب کا صحافتی کارنامہ ''سرینگر ٹائمز'' آج بھی ہمیں ہر صبح صوفی صاحب کی یاد دلاتا ہے اور جب تک ''سرینگر ٹائمز'' رواں دواں ہے، صوفی صاحب حیات ہیں بلکہ مرحوم کو ''سرینگر ٹائمز'' کے زندہ رہنے سے حیاتِ جاوداں حاصل ہو گئی۔

☆......ڈاکٹر حسرت حسین

صوفی غلام محمد - کشمیری افسانے کا اہم ستون

کشمیری ادبیات کے مورخ برادراں ناجی منور اور شفیع شوقؔ اپنے تذکرے میں صوفی غلام محمد کے حوالے سے کچھ یوں رقمطراز ہیں:-

''صوفی غلام محمد چھٹی دہائی کے آخر میں ایسے، خاکہ جات اور افسانے لکھ کر کشمیری ادب کی دُنیا میں وارد ہوتے ہیں، صوفی پیشہ سے صحافی ہیں، ۔۔۔، شیشہ اور سنگستان، آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں سات افسانے موجود ہیں۔

صوفی کردار اُبھارنے اور ماحول کو شدت بخشنے میں ید طولیٰ کے مالک ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہی خاص ادبی امتزاج آپ کے افسانوں میں دلچسپی کا ساماں پیدا کرتے ہیں۔'' [1]

دیکھا جائے تو اپنے دور کے افسانہ نگاروں کے دوش بدوش صوفیؔ صاحب نے نہ صرف افسانوی ادب میں اپنی ایک باقاعدہ شناخت بنالی ہے بلکہ آپ نے عمومی سطح پر کشمیری افسانوی ادب میں ایک جدت پسندانہ تحریک کو جلا بخشی جو نوعمر افسانہ نگاروں کے لئے ایک ایسی مشعل راہ ثابت ہوئی اور جس کی ادبی تروتازگی اور ارتعاش پسندی آج تک موجود

[1] نوو کاشرِ ادبُک تواریخ ۱۹۹۲ء ناجی منور، شفیع شوق صفحہ ۲۹۳۔

ہے۔صوفی صاحب کشمیری افسانوی ادب کے جلیل القدر اُدبا میں اپنا ایک منفرد نام اور پہچان اُبھارنے میں کامیاب ہوئے۔

شیشہ تہ سنگستان (شیشہ اور پہاڑ) صوفی صاحب کی اولین افسانوی کاوش ہے۔اس میں غالباً سبھی افسانوں میں جو خاص ادبی مصارف دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ ازخود اس بات کے غماز ہیں کہ آپ میں افسانوی ادب کو ادبی کسوٹی پر پرکھنے کا باقاعدہ ادبی جمال اور جلال Literal Exaltation کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

صوفی صاحب کے افسانوں کے کرداروں میں حسِ مزاح اور حسِ طنز کا امتزاج بدرجہ اتم موجود ہے۔شاید یہی ایک خاص وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں کو لوگ آج آدھی صدی کے بعد بھی اچھی طرح سے پسند کرتے ہیں۔اتنا ہی نہیں آپ کے افسانوں میں اُس بھید بھاؤ والے معاشرے کا پردہ چاک کیا گیا ہے جس میں استحصالی عناصر اور خودغرض اشخاص اپنی ذاتی اَنا کو بروئے کار لانے کے لئے وہ سبھی وسیلے کام میں لاتے ہیں جن کی بدولت آئے دن غریبوں، ناداروں، محنت کشوں، مزدوروں اور کامگاروں کا استحصال کرتے ہیں۔ایسے میں دیکھا جائے تو صوفی صاحب کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کی حسِ شعور کارفرما ہے۔اِن سبھی افسانوں میں بھید بھاؤ، ذات پات، اونچ نیچ، امیری غریبی، اعلیٰ ادنیٰ کشاکش کا نہ صرف فاضل افسانہ نگار نے پردہ چاک کیا ہے جس کی بدولت ہماری معاشرتی زندگی کو غیر شعوری طور پر ایک نئی سمت ملتی ہے۔

صوفی کے افسانوں میں سب سے بُلند بانگ اور دَرد آمیز افسانہ ''ژٕنہِ ژٕوٗر'' ہے۔ یہ افسانہ بجائے خود ایک ادبی کائنات سے عبارت ہے جس کا حقیقی خالق کوئی اور نہیں بلکہ بجائے خود افسانہ نگار ہے۔

افسانے میں چار کردار ہیں، ایک دُکان کا مالک جس کا نام سُلطان صوفی ہے، جو ایک تُند مزاج اور اَنا پسند شخص ہے اور ہر وقت اپنے تین مزدور پیشہ آدمیوں سے ازحد کام لے کر اُنہیں اپنا وہ برتاؤ اور معاوضہ پیش نہیں کرتا جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔

صوفی کے افسانوں کے مشہور کردار مال دید، احمد ریشی، تنزہ کھور، شپلہ، مہدہ، عجب ملک اور نوش لب ایسے لافانی کردار ہیں جو صوفی صاحب کی افسانوی اُپج کا بین ثبوت ہیں۔ ایسے میں دیکھا جائے تو شیشہ اور سنگستان نے صوفی صاحب کو کشمیری افسانوی ادب میں ایک ایسا مقام عطا کیا جس کی ادبی پرچھائیاں آنے والے زمانے تک یاد کی جائیں گی۔ ایسے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صوفی صاحب ایک عہد آفرین اور عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔

صوفی صاحب کی دوسری افسانوی کتاب ''لۆسۍ متۍ تارکھ'' ہے ''غروب ہوئے ستارے'' جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے اس میں جذباتی صورتِ حال کو ظاہری سطح سے اُٹھا کر داخلی آمیزش میں پیوستہ کرانے کا ایک حسرت و یاس کا معاملہ (Wistfull endeavour) جاگزیں ہے۔ اس میں بھی کرداروں کی ایک ایسی مُنہ بولتی تصویر سامنے آتی ہے جس میں معاشرتی زندگی کی کشاکش نظر آتی ہے۔ یاد رہے اس افسانوی مجموعے پر صوفی صاحب کو ریاستی کلچرل اکادمی کی جانب سے انعام بھی ملا ہے۔

بہر کیف یہ بات باعث فخر ہے کہ صوفی صاحب نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے صحافی تھے بلکہ آپ ایک عہد ساز افسانہ نگار بھی رہے ہیں۔ صوفی صاحب کے افسانوی اور انشائیوں میں وہ ادبی مواد Literal Potential بدرجہ اتم موجود ہے جس کی بدولت آپ کی ادبی تحریروں کو ملکی اور عالمی سطح پر پذیرائی ملنا مقصود تھی۔
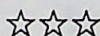
☆......عادل اسماعیل

صوفی غلام محمد - غیر مصلحت پسند صحافی

ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی داغ بیل سے متعلق اگر چہ متضاد رائے سامنے پائی جاتی ہے تاہم اُردو صحافت کی بات کرتے ہی وادی سے تعلق رکھنے والے دو سپوت اور ممتاز صحافی ثناء اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد کے نام یاد آتے ہیں۔ جس دور میں اُنہوں نے صحافت کے شعبہ میں قدم رکھا وہ نہ صرف پُر آشوب تھا۔ اس سلسلے میں ایک شاعر کا یہ شعر یاد آتا ہے جو بر محل بھی ہے:

آج تحریر اپاہج ہے، قلم گونگا ہے
کتنا مشکل ہے ستم گر کو ستم گر لکھنا

اُس دور میں اگر چہ وادی سے اردو زبان میں کئی اخبارات شائع ہو رہے تھے، تاہم ان پر سیاسی اثر ورسوخ کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے وہ اخبار عوامی خواشات پر پورا نہیں اتر رہے تھے۔ ان حالات میں اخبار شائع کرنا اور پھر اس کی اشاعت کو جاری رکھنا نہ صرف کارِدار والا معاملہ تھا بلکہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس کی وجہ سے آدمی کو نہ صرف عتاب کا شکار ہونا تھا بلکہ اخراجات کو پورا کرنے کیلئے رقومات کا انتظام بھی کرنا تھا جو کہ ایک سخت کام تھا۔ چونکہ لوگوں کی آواز کو سرکاری ایوانوں تک پہنچانے اور پھر اُن کے مسائل کے سدباب کے لئے ایسا کرنا لازمی تھا۔ وادی کے ان سپوتوں نے تمام چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے وادی سے اُردو اخبارات شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اِس

پر عملی طور بھی کام شروع کیا۔ اس دوران اُنہیں کئی بار تنگ وطلب بھی کیا گیا اور اخبار شائع کرنے کیلئے مختلف دستاویزات کو تیار کرنے میں بھی کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال انہوں نے تمام مشکلات اور مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اس کام کو عملی طور کر کے دکھایا جو کہ ریاست جموں وکشمیر کی اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

وادی سے شائع ہو رہے موقر اُردو روزنامہ ''خدمت'' سے صحافتی سفر کا آغاز کرنے والے نوجوان، صوفی غلام محمد کو اِس دوران کئی منجھے ہوئے صحافیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا جنہوں نے صرف اُن کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی۔ جوش و جذبے سے بھر پور نوجوان صحافی کی صحافت کے تیئں لگاؤ کو دیکھتے ہوئے اُنہیں مستقل طور لکھنے کی ترغیب دی جس کی وجہ سے اُن کی صلاحیتیں نکھر گئیں۔ رفتہ رفتہ آپ کی تحریر میں روانگی آگئی اور آپ سماج میں رونما ہو رہے روزمرہ کے مختلف معاملات کو اخبار کی زینت بناتے رہے۔ شاید صحافتی شعبہ میں اُن کی کامیابی کا یہی راز بھی ہے۔ لوگوں کے مسائل اور مشکلات کو سامنے لا کر اُن کی جانب سرکار کی توجہ مبذول کرانے والے اس نوجوان صحافی کے اندر کا صحافی کہاں سکون پاتا تھا۔ چونکہ کہا جاتا ہے کہ اچھے صحافی میں کھرے اور کھوٹے میں فرق کرنے کے گن موجود ہوتے ہیں اور وہ کھری بات کہنے کا قائل ہوتا ہے۔ صوفی صاحب کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ حقیقت کو سامنے لانے میں کسی مصلحت کا شکار ہو کر اثر ورسوخ یا دباؤ میں آکر اپنے قلم کو دوسری جانب موڑ لیتے۔ اُنہوں نے بے باک صحافی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام رکاوٹوں کو پھاندتے ہوئے ایک آزاد صحافی کے بطور اپنے صحافتی فرائض کو انجام دینے کا علم بلند کیا جس کو وہ آخری دم تک تھامتے رہے۔

میں زہر ہلال کو کبھی کہہ نہ سکا قند

راقم کو دوبار صوفی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ پہلی بار اُن کے

موقر اخبار ''سرینگر ٹائمز'' میں ایک رات کام کیا۔ چونکہ اخباری دفاتر میں شام کا وقت انتہائی پُر مشقت اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ اس لئے اُس وقت صوفی صاحب نے میرے ساتھ زیادہ بات نہیں کی۔ وہ اپنے کام میں محو تھے۔ ایک نظر روزمرہ رونما ہونے والے حالات و واقعات اور دوسری نظر ریاستی اور ملکی سیاسی منظر نامے پر۔ چونکہ اُن دنوں انٹرنیٹ نہیں تھا اور ٹیلیفون اور یو۔این۔آئی خبروں کے حصول کے واحد ذرائع تھے اس لئے صوفی صاحب رات دیر گئے تک یواین آئی کی جانب سے لگائی گئی مشین سے تازہ ترین خبروں کا مشاہدہ کرتے رہے۔ جوں ہی مشین میں نیوز آنے کا الارم بجتا تو وہ الرٹ ہو کر مشین سے وہ پرچی منگواتے اور اگر کوئی اہم خبر ہوتی تو خود خبر بنا کر اس کی اہمیت کے مطابق پہلے یا اندرونی صفحات کی زینت بنا دیتے۔ اس دوران وہ خود اخبارات میں شائع ہو رہے مواد کے املا کو درست کرتے تا کہ قارئین سے املا سے متعلق کوئی شکایت نہ آئے۔ صوفی صاحب مواد کو صحافتی تقاضوں کے عین مطابق بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے اور کمپیوٹر آپریٹروں کو بھی کئی بار مواد کی تصحیح کرنی پڑتی تھی۔

راقم الحروف کو جو کام اُس رات تفویض کیا گیا، اس کو وقت پر ختم کرنے کی کوشش میں ہی تھا کہ آفس بوائے نے صوفی صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی دو خبریں یہ کہہ کر مجھے سونپ دیں کہ پہلے یہی خبریں ٹائپ کرو۔ بہر حال میں نے باقی کام کو التوا میں رکھ کر ان خبروں کو ٹائپ کر کے پرنٹ آوٹ نکالا اور آفس بوائے کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد آفس بوائے دوبارہ حاضر ہوا اور کہا کہ اس کی کریکشن کرو۔ میں نے جب سکرپٹ کو دیکھا تو دو خبروں میں دو غلطیاں تھی مگر دونوں ٹائپنگ کی غلطیاں تھیں۔ میں نے غلطی دور کر کے ان خبروں کا پرنٹ آوٹ آفس بوائے کے حوالہ کیا اور پھر التوا میں رکھے کام کو دوبارہ شروع کیا۔ بہر حال کام ختم کرنے کے بعد جب کھانا کھانے کا وقت آ گیا تو مجھے صوفی صاحب نے اپنے کمرے سے متصل کمرے میں بُلایا اور وہاں پر ہی

کھانا کھانے کو کہا اور وہیں پر میرے سونے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔غرض اچھی طرح سے میری مہمان نوازی کی گئی۔صبح جب اُٹھا تو صوفی صاحب اپنے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس دوران چائے کی چسکی بھی لے رہے تھے۔میرے لئے بھی وہیں پر چائے منگوائی۔ مجھے سے ہم کلام ہوئے تو کہا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کیا پڑھا ہے۔کہاں کہاں کام کیا ہے؟ اس وقت کیا مصروفیات ہیں؟ غرض پوری طرح سے جانکاری حاصل کی۔ مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اُنہوں نے کل جو خبریں مجھے ٹائپ کرنے کیلئے دی تھیں، وہ مجھے پرکھنے کے لئے دی گئیں تھیں۔تاہم اس دوران اُنہوں نے تبسم فرما کر کہا ''اُردو آپ کی ویسے ٹھیک ہی ہے۔میں نے جو خبریں کل آپ کو دیں وہ جان بوجھ کر میں نے ٹھیک نہیں لکھی تھیں۔آپ نے کئی ایک جگہ پر جملے بھی ٹھیک کئے تھے۔مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ آپ اس کو لکھ پاؤ گے۔'' اخبار سے متعلق مختلف باتیں ہوئیں اور آخر پر اُنہوں نے کہا: ''چونکہ سرینگر ٹائمز ایک بڑا اخبار ہے، اس میں کام کرنے سے آپ کا نام ہو جائے گا اور آپ کی صلاحیتیں مزید نکھر جائیں گی۔اس لئے آپ یہاں ہی کام کیجئے۔'' چونکہ میں روزگار کمانے کے سلسلے میں پہلے سے ہی کئی ایک اخبارات میں کام کر رہا تھا اس لئے میں اُن کے ہاں کام نہیں کر سکا تاہم اُنہوں نے کئی بار مجھے دفتر آنے کے لئے کہا۔

صوفی غلام محمد نہ صرف اُردو زبان کے دلدادہ تھے بلکہ کشمیری زبان سے بھی انہیں کافی دلچسپی اور لگاؤ تھا، جس کا بین ثبوت اُن کے کشمیری افسانے ہیں جنہیں کشمیری زبان میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔صوفی صاحب نے نہ صرف کشمیری زبان کو اپنی ادبی زبان بنایا بلکہ آپ مادری زبان کی اہمیت اور افادیت سے بھی واقف تھے اس لئے کشمیری زبان کو صحافتی زبان بنانے کے لئے بھی کوشاں تھے۔اس سلسلے میں صوفی صاحب نے عملی کوششیں بھی کیں۔انہوں نے وادی سے کشمیری زبان میں اخبار شایع کرنے کے لئے ریاست کی سب سے بڑی ادبی تنظیم ''ادبی مرکز کمراز''

سے بھی صلاح ومشورے جاری رکھے اور اس طرح ادبی مرکز سے وابستہ قلمکاروں اور ادیبوں سے کشمیری میں اپنی تخلیقات متواتر طور بہم رکھنے کی درخواست کے بعد 2004ء میں ''کاشُر سرینگر ٹائمز'' نامی ایک پندرہ روزہ اخبار کی اشاعت شروع کی۔ یہ راقم کے لئے صوفی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا دوسرا موقعہ تھا۔ اس دوران صوفی صاحب نہ صرف اس کشمیری پندرہ روزہ اخبار کے لئے خبریں تجویز کرتے تھے بلکہ قلمکاروں، ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے بھیجی گئیں تخلیقات کو صحافتی جامہ پہنا کر اِن کو مزید دلچسپ بناتے تھے۔ چونکہ صوفی صاحب قارئین کی پسند اور ناپسند سے بخوبی واقف تھے اِس لئے وہ بھیجے گئے مواد کا بغور جائزہ لے کر اس سے چیدہ چیدہ تخلیقات کا انتخاب عمل میں لاتے تھے اور اخبار کو زیادہ سے زیادہ جاذبِ نظر بنانے پر توجہ مبذول کرتے تھے۔ کشمیری زبان کی صحافتی تاریخ میں اس اخبار کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس اخبار کے چھ سات شمارے شایع بھی ہوئے اور لوگوں میں اس کی کافی پذیرائی بھی ہوئی، تاہم مالی تنگ دستی، کشمیری زبان میں خبریں اور دیگر مواد کی عدم دستیابی اور اور کشمیری زبان کے قلمکاروں کی طرف سے اخبار کے لئے وقت پر اپنی تخلیقات بہم نہ رکھنے کی وجہ سے یہ اخبار زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ لیکن صوفی صاحب کشمیری زبان کے دلدادہ تھے اور اُنہیں اس کی ترویج کی فکر لاحق تھی، یہی وجہ تھی کہ جب آپ قانون ساز کونسل کے ممبر بنے تو آپ نے اپنی کانسچونسی فنڈ کو اپنے حلقے کی تعمیر وترقی کے بجائے کشمیری زبان کے قلمکاروں اور ادیبوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کا اعلان کیا۔

صوفی غلام محمد کے
کشمیری افسانوں کے
تراجم
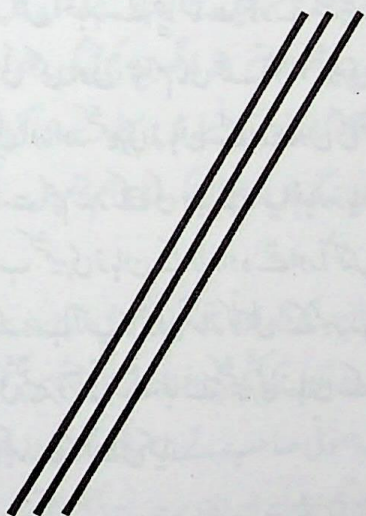
☆......صوفی غلام محمد
(کشمیری سے ترجمہ: نور شاہ)

گنجا

تقدیر کی شوخی! اس گنجے کو بھی جیسے کوئی اور جگہ نہ ملی تھی! جوں ہی میم صاحب کی نظریں اس کے تانبے کی طرح چمکتے سر پر پڑیں اسے ابکائیاں سی آنے لگیں۔ پانی میں تھوکتے ہوئے وہ نیم وا آنکھوں سے ہاؤس بوٹ کے اندر گھس گئی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ اندر صبورا میز پر ناشتہ لگا رہا تھا اور صاحب نرم گداز ریشمی لحاف اوڑھے گہری نیند سویا نہ جانے کن خوابوں میں کھویا ہوا تھا۔۔۔!

''صبورا'' میم صاحب نے گھبراہٹ کے عالم میں پکارا

صبورا کے ہاتھ سے وہ پانی گر گیا جسے وہ میز پر سجانے جا رہا تھا

''کیا بات ہے، میم صاب''۔

''دیکھ لو اُدھر اس گنجے کو۔۔۔ میں اسے ہر صبح اپنے گنج پر بے تحاشا ہاتھ پھیرتے دیکھتی ہوں۔ مجھے اُس سے نفرت ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے قے سی ہونے لگتی ہے۔ میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ سنو، اگر یہ آدمی پھر یہاں نظر آیا تو ہم تمہارا ہاؤس بوٹ خالی کر دیں گے''۔

''میم صاب۔ میں۔۔۔ میں اس کا نام ونشان مٹا دوں گا۔''

صبورا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ گنجے کو واقعی

کچا چبا جائے گا۔ دوسرے لمحے اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا، گنجا نہار ہا تھا۔ اس کا سر پانی کی سطح پر ابھرتا ڈوبتا نظر آتا تھا۔ صبورا کو غصہ آیا۔ اس نے سوچا ایک پتھر اس گنجے کے سر پر مار کر اس کی کھوپڑی کھول کر رکھ دے، اسے لہولہان کردے۔ وہ ہاؤس بوٹ کے آخری سرے پر آیا اور گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔۔۔ ''اس سیزن کے پہلے خریدار تھے میم صاب اور صاحب''۔۔۔ ولایتی میم اور صاحب۔۔۔ روپیہ خرچ کرنے والے۔۔۔ میرے ہاں جل پری آئی ہے، جل پری اور میں کیا اسے جانے دوں گا، ہرگز نہیں۔'' وہ چلا اٹھا۔۔'' او گنجے، چلے جاؤ یہاں سے۔ نہیں تو دریا برد کردوں گا۔

گنجے نے سنا لیکن خاموش رہا۔ اس خاموشی نے صبورا کو اور بھی پریشان کردیا اور وہ گالیاں بکنے لگا۔ آس پاس کچھ لوگ جمع ہوگئے۔ انہیں دیکھ کر صبورا موٹی موٹی گالیوں پر اتر آیا اور ہاوس بوٹ سے شکارے میں آگیا۔ گنجا کچھ سہم سا گیا۔ وہ کنارے پر چلا آیا۔ لوگ اسے نیم عریاں دیکھ کر بھاگ گئے! صبورا کا شور سُن کر اب صاحب بھی جاگ گئے تھے۔

انگریز میاں بیوی کو صبورا کے ہاوس بوٹ میں آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی جگہ جگہ گھوم کر اب کشمیر آئے تھے اور صبورا کے ہاوس بوٹ ''ڈل کوئن'' میں ٹھہرے تھے جو ڈل جھیل کے ایک گوشے میں دلہن کی طرح سجا سنورا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا شاداب باغیچہ تھا جس میں رنگ برنگی پھول کھلے تھے۔ ایک طرف سپیدے کے درخت جن کے سائے میں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو۔ ڈل جھیل کے پانیوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بادنسیم، سونے جیسی کرنیں، چھینکتا ہوا سورج، قطار اندر قطار تیرتے ہوئے ہنس، بلندی سے گرتی ہوئی پانی کی دھار، ایک دلچسپ سماں دل کو لبھانے والا۔۔۔ اور پھر سامنے کوہ سلیمان کے دامن میں بیلوارڈ روڈ پر صبح وشام موٹروں کی آمد ورفت۔ سڑک کے آگے محلّہ، اَن گنت مکان اور ان میں رہنے والے لوگ۔ ایک عجیب سی زندگی، بے حد مصروف، دور پہاڑیوں کا طویل سلسلہ اور ان کے اوپر بادلوں

کا سفر، ندی نالے، آبشار، یہ حسن، یہ شباب ۔۔۔ یہ دیکھ کر دل مچل مچل جاتا۔ ان دلفریب نظاروں اور ہاؤس بوٹ ڈل کوئن، میں بڑی گہری وابستگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے اکثر سیاح جب دوسرے ہاؤس بوٹوں کی طرف دیکھنے لگتے تو ان کی نظریں صبورا کے ہاؤس بوٹ پر پڑتے ہی رُک سی جاتیں۔ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک سی جاتیں۔ انگریز سیاح تو صبورا کے ہاؤس بوٹ پر جیسے فریفتہ ہو گئے تھے۔۔۔!

صبورا کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ولایتی میم اور صاحب کو ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا اور صبورا کے لئے یہ ایک مہینہ ایک سال کے برابر تھا۔ اس ایک مہینے کی کمائی سے وہ ایک سال کا خرچہ برداشت کر سکتا تھا۔۔۔ لیکن یہ گنجا!

میم صاب کو یہ گنجا پہلے ہی دن نظر آیا تھا۔ وہ دور پہاڑی نظاروں کا جائزہ لے رہی تھی اور یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظریں ایک عجیب سی انسانی صورت سے ٹکرائی تھیں۔ وہ پانی میں ڈبکیاں لگا رہا تھا اور بار بار اپنے تیز ناخنوں سے اپنے سر کو کھرچ رہا تھا۔ میم صاب کو یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ اسے متلی ہونے لگی تھی۔ اس کے ملک میں اگر کسی کتے کی بھی ایسی حالت ہوتی تو اس کا سارا جسم صابن سے دھویا جاتا اور ٹیکوں کے ذریعے اس کے جسم سے یہ زہر باہر نکالا جاتا۔۔۔ لیکن یہ ملک۔۔۔ یہاں یہ گنجا پانی میں نہا کر سارے پانی کو گندہ کرتا ہے اور اس کے جراثیم پانی میں پھیل جاتے ہیں اور اسی پانی کی سطح پر یہ ہاؤس بوٹ کھڑا ہے!

''میرے خدا'' یہ میں کہاں آ گئی۔۔۔'' اسے ہاؤس بوٹ سے نفرت ہو گئی۔ اس ہاؤس بوٹ میں بچھے قیمتی قالینوں سے نفرت ہو گئی۔ رنگ رنگ کے پھولوں سے نفرت ہو گئی۔ آس پاس کی ساری چیزوں سے نفرت ہو گئی۔ یہ پہاڑ اسے جن اور بھوت نظر آنے لگے۔ پانی میں اچھلتی مچھلیاں اسے سانپ دکھائی دینے لگیں!

وہ یہ سب کچھ چار دنوں سے برابر دیکھ رہی تھی پہلے دن اس نے سوچا کہ اب شاید یہ گنجا نظر نہیں آئے گا لیکن جب وہ دوسری صبح کوہ سلیمان کا فوٹو لینے لگی تو اس کا سر پانی سے

ابھر آیا۔ میم صاب کو بہت خوف محسوس ہوا تھا۔ اسے ہر سمت اس کی صورت نظر آنے لگی۔۔۔ گنجے کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، چہرے پر ہڈیاں ابھر آئیں تھی۔

اور آج میم صاب گنجے کو دیکھ کر دبے دبے سے لہجے میں چیخ رہی تھی!

صبورا نے گنجے کو بھگا دیا تھا لیکن اب بھی اس کی صورت میم صاحب کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی تھی اور اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا تھا!!

دونوں میاں بیوی اس دن شاپنگ کے سلسلہ میں بڑے بازار کی طرف نکل پڑے۔ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ ایک ''وُڈ کاروینگ'' کی دوکان میں گھس گئے۔ وہ بہت شوق سے کاریگروں کو کام کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کام دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ مہاتما بدھ کا مجسمہ، بطخ، ہنس، پمپوش، چنار کے پتے۔۔۔ جیسے سب کچھ زندہ جاوید ہو!

''واہ! کس قدر خوبصورت ہے یہ فن، یہ آرٹ، یہ کاریگری۔''

میم صاب نے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ایک سے ایک بڑھ کر اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے یہ پھول یہ پتے۔۔۔ کیا یہ سب چیزیں انہی لوگوں نے بنائی ہیں۔ شاید نہیں، یہ کمزور انسان یہ بے حس انسان ان چیزوں کی کیسے تخلیق کر سکتے ہیں۔ ان میں ایسا احساس کہاں ہوسکتا ہے۔ یہ فن تو زندہ جاوید ہے۔ ان کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔۔۔''

وہ ایک ''ایمبرائیڈری'' کی دوکان میں آگئے۔ سوئی اور دھاگا۔ معمولی چیزیں لیکن ان کے ساتھ انسانی انگلیوں کا کمال۔ سپید رفل پر کڑھا ہوا یہ کام۔۔۔۔ پھولوں کا یہ شاداب چمن۔ سپید کپڑے پر کس نے بکھیر دیا ہے۔ اس میں یہ رنگ کس نے بھرے ہیں۔ کون ہوسکتا ہے، کس کے ہاتھ ہیں یہ؟ کس کی انگلیاں۔۔۔'' میم صاب نے اپنی نرم و نازک انگلیاں اس پر پھیر دیں۔ صاحب ایک جیکٹ دیکھنے لگا۔ ایک سبز رنگ کا جیکٹ جس کے دونوں کندھوں پر پھولوں کی کیاریاں بہت خوبصورتی کے ساتھ کاڑھی گئی تھیں۔ صاحب نے ہینگر سے جیکٹ اتار لیا اور پہن لیا یہ جیکٹ پہن کر صاحب کا چہرہ ایسا نظر آنے لگا جیسے

سر سبز پتوں میں گلاب کا پھول دکھائی دیتا ہے۔!

اس کے آگے ایک اور دوکان تھی۔۔۔ کشمیر پیپر ماشی سینٹر'' میم صاب اور صاحب اس دوکان کے اندر چلے گئے۔اندر جاتے انہیں محسوس ہوا جیسے وہ کسی طلمسی محل میں آ گئے ہوں جہاں جادو کے زور سے سب کچھ بن جاتا ہے۔انہیں بالکل یقین نہیں آیا کہ چیزیں کسی انسان نے بنائی ہوں گی۔دوکان سامان سے بھری پڑی تھی۔دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف ایک طلمی دنیا تھی۔پیپر ماشی کی دنیا جسے دیکھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ یہ واقعی انسانی ذہن اور ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔۔۔؟ یہ انسان نہیں ہوسکتا۔کوئی اور طاقت ہے۔یہ فن، یہ کاریگری اس حد کو بھی چھوسکتی ہے۔یہ سنگار کیس، صابن دانی، پھول دان، سگریٹ کیس، قلمدان، تصویروں کا فریم۔یہ کس کا کمال ہے! میم صاب نے اپنے لئے بہت چیزیں خرید لیں!

''کس قدر عظیم ہوگا یہ فنکار جس نے رنگوں سے بے جان زندگی میں حسن بھر دیا ہے۔ہمیں اس فن کی قدر کرنی چاہئے، ان فنکاروں کی عزت کرنی چاہئے۔صاحب نے کہا۔''میں اس فنکار کو دیکھنا چاہتی ہوں جو اس آرٹ کا خالق ہے'' میم صاب نے کہا صاحب نے دوکاندار کی طرف دیکھا۔

یہ چیزیں بنانے والے فنکار دوکان کے ساتھ ہی بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے جس کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی۔اس کھڑکی سے روشنی آتی تھی اور اسی روشنی میں وہ کام کرتے تھے۔کمرے میں بہت سی چیزیں بکھری پڑیں تھیں۔کمرے کی دیواریں کالی سیاہ ہوگئی تھیں۔ان دیواروں پر مختلف رنگوں کے داغ پڑ گئے تھے۔اس کمرے کی طرف کبھی کبھار ہی کوئی سیاح آتا۔سیاحوں کا فنکاروں سے کیا واسطہ۔وہ فن خریدتے ہیں اس کمرے میں جتنی بھی چیزیں بکھری پڑیں تھیں ان کے نمونے شوروم میں سجے ہوئے تھے۔اس فن میں حسن پیدا کرنے کیلئے کاریگروں کو اپنا خونِ جگر شامل کرنا پڑتا ہے۔وہ اپنے جسموں کی قوت، آنکھوں کی بینائی اور انگلیوں کی خوبصورتی کو ختم کر کے ان ساری چیزوں کو

زندگی بخشتے ہیں۔ یہ کاریگر فن کے مختلف نمونے بنا کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیتے ہیں۔ان کی تعریفیں ہر شخص کرتا ہے لیکن وہ فنکار، وہ کاریگر وہ آرٹسٹ جو یہ سب چیزیں بناتا ہے اسے کوئی بھی نہیں جانتا۔اس کے بارے میں کوئی پوچھتا تک نہیں۔۔۔وہ گمنام ہے۔

آج ایک ولایتی میم اور صاحب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اس کمرے میں گمنام آرٹسٹ کی تلاش میں آئے تھے۔دوکان کا مالک ان کے ساتھ تھا۔کمرے میں قدم رکھتے ہی میم صاب اپنی آنکھیں مسلنے لگی۔باہر روشنی تھی اور اندر تاریکی۔کچھ دیر کے لئے انہیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

اب میم صاب کھڑکی کے قریب تھی۔ایک گوشے میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ان کے اِرد گرد رنگ کے ڈبے اور دوسرا سامان پڑا تھا۔دوکاندار نے ایک کاریگر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔"میم صاب، یہ ہمارا آرٹسٹ ہے، ہمارا کاریگر۔"

میم صاب کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ ایک بار پھر اپنی آنکھیں مسلنے لگی اور پھر گھور گھور کر دیکھنے لگی۔۔۔ایک دبی دبی سی چیخ ابھری۔۔۔"گنجا۔۔۔گنجا۔۔۔صاحب نے میم صاب کو تھام لیا۔۔۔"یہ وہی ہے جو صبح سویرے ہمارے ہاوس بوٹ کے سامنے نہایا کرتا ہے۔۔۔!"

"گنجا۔۔۔"

وہی گنجا جسے دیکھ کر اسے متلی ہونے لگی تھی۔۔۔اب ایک عظیم فنکار کی حیثیت میں اس کے سامنے تھا۔

☆......صوفی غلام محمد
(کشمیری سے ترجمہ: نور شاہ)

دیواریں

دھرم سنگھ کی زندگی یوں تو ایسے ان گنت واقعات سے بھرپور تھی لیکن آج کا واقعہ اس کی نظروں کے سامنے اتھل پتھل مچا رہا تھا۔ وہ اس کے لئے کافی چونکا دینے والا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا خواب کبھی حقیقت کا روپ نہیں اپناتے مگر آج اس نے دیکھا کہ خوابوں نے سچ مچ حقیقت کا پیرہن اوڑھ لیا تھا۔ پورے بیس سال بعد آج پھر ایک بار دھرم سنگھ اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا، وہ گاؤں جہاں اس نے جنم لیا تھا، جہاں اس کا بچپن، اُس کا لڑکپن گزرا تھا، جہاں اس کی جوانی نے ایک نیا رنگ اور روپ اپنا لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ فسادات، یہ لوٹ مار اور جنگ کیسے عام آدمی کو گھر سے بے گھر بنا دیتی ہے۔ یہ جنگ ہمیشہ اپنے ساتھ بربادی اور پشیمانی لاتی ہے مگر دھرم سنگھ سوچ رہا تھا، اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو اس کے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے ہوتی۔ اس نے بس ایک لمحے میں عمر کی بیس منزلیں طے کی تھیں۔ وہ پھر اسی گاؤں میں لوٹ آیا تھا جہاں کے درختوں کی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں میں اس کا بچپن گزرا تھا، جہاں کی ندیوں کی شیریں گہرائیوں میں مچھلیوں کی طرح اپنے پاؤں پھیلائے ڈبکیاں لگائی تھیں۔ جہاں اس نے سورج ڈوبتے وقت ہیرا رانجھا کے مدھر رسیلے بول گنگنائے تھے اور جہاں اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبڈی کھیلی تھی۔ یہ جنگ اس کے

خوابوں کی زندہ جاوید تصویر تھی۔صرف ایک دن پہلے اسے پتہ چلا کہ کل سویرے وہ دشمن پر حملہ کرنے جارہے ہیں مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ کونسی جگہ ہوگی۔اپنا گاؤں، اپنی دھرتی، اپنی مٹی۔افسر لوگ آخری لمحہ تک نہیں بتاتے کہ حملہ کب، کیوں اور کس جانب ہوگا۔فوجیوں کو جنگ کا احساس بس اس لمحے ہوتا ہے جب اُن کی بندوقیں آگ اگلنا شروع کردیتی ہیں۔ ہواؤں میں زہر گھل مل جاتا ہے، انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے، سانسیں رکتی ہیں اور لاشوں کے انبار لگ جاتے ہیں لیکن دھرم سنگھ کی زندگی آج پہلی بار اس واقعہ سے دوچار ہورہی تھی جب اسے اپنے افسر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور حکم سن کر اسے ان راہوں کی خوشبو کا احساس ہوا تھا جن راہوں نے بیس سال پہلے آخری بار اس کے قدموں کے نشان میں اپنے وجود کو گم کر دیا تھا۔دھرم سنگھ کو یاد آیا ستمبر کے یہی دن تھے،خزاں کی پُراسرار زردیاں چھانے لگی تھیں، کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں، جب وہ اپنے گھر سے بے گھر ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر چٹانوں اور پھیلے ہوئے درختوں کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا۔اس دن ایک قیامت بپا ہوئی تھی، ماں کو اس کے بیٹے کا علم نہ تھا، بھائی بھائی سے بچھڑ گیا تھا، جن کھیتوں میں دل لبھانے والے گیت گائے جاتے تھے ان میں معصوم بچوں کی چیخیں اور زخمی عورتوں کی آہیں ابھر ابھر کر دھرتی کے سینے کو چیر رہی تھیں۔ جہاں دھرم سنگھ، رحیم خان، کرشن تلک اور محمود کبڈی کھیلا کرتے تھے وہاں انسانوں کے کٹے ہوئے سر بکھرے پڑے تھے۔دھرم سنگھ جب اپنے گھر سے باہر نکلا تو اس کی بیوی پہلے ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔دھرم سنگھ کو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کیا بیتی۔وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آج بھی زندہ ہو۔دھرم سنگھ سوچ رہا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کرتے جارہا تھا، بچپن اور جوانی کے واقعات جن پر نہ جانے کتنے سالوں کی گرد جم چکی تھی، آج ایک ایک کر کے اسے یاد آرہے تھے۔اس کی نظروں کے سامنے چمک رہے تھے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، یہ ٹھیک ہے کہ جنگ کے دوران توپوں کی گن گرج میں ایک فوجی کے لئے ایسا سوچنا بڑا ہی کٹھن ہے لیکن جب ایک خواب اچانک حقیقت کا روپ اپنا لیتا ہے تب میدانِ جنگ میں بھی ایک فوجی

خندق، ایک سپاہی کے لئے اس کے گھر کا کمرہ بن جاتی ہے۔ خصوصاً جب یہ خندق اس رات کی آغوش سے لپٹی ہوئی ہو جس کے ساتھ اس کے بچپن اور پیار کا سمبندھ رہا ہو۔ دھرم سنگھ نے اپنی زندگی میں کئی جنگیں دیکھی تھیں۔ دھرم سنگھ کو وہ لمحہ بھی یاد آیا جب اس کے گاؤں کا ساتھی رحیم خان دشمن کی گولی لگنے سے منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔ دشمن بھاری تعداد میں آگے بڑھ رہا تھا، گولیوں اور توپوں کی آگ چاروں سمت پھیلی ہوئی تھی۔ دشمن کی طوفانی پیش قدمی دیکھ کر فوجی افسروں نے اپنے سپاہیوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ جب دھرم سنگھ حکم کی تعمیل میں اپنی خندق سے باہر نکلنے لگا تھا تو رحیم خان نے یاس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا وہ زخمی ہو چکا تھا اور خون رس رس کر اس کے سارے جسم کو رنگ رہا تھا۔ وہ جینے کی خاطر موت سے لڑ رہا تھا مگر اس کے جینے کی آس تبھی پوری ہو سکتی تھی جب اس کو کوئی سہارا دیتا۔ دھرم سنگھ اس قدر بے رحم نہ تھا کہ اپنے بچپن کے ساتھی کو یوں اکیلا چھوڑ دیتا۔ اَن گنت خطرات سے بے نیاز ہو کر دھرم سنگھ نے زخمی رحیم خان کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر خندقوں اور پُر خطر گھاٹیوں کو عبور کر کے ایک محفوظ مقام پر پہنچا کر ہی دم لیا۔ دھرم سنگھ نے رحیم خان کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ دھرم سنگھ کو وہ واقعہ بھی یاد آیا جب رحیم خان نے اپنی زندگی کا یہ قرضہ اسے چکا دیا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب دھرم سنگھ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی دن اسے کھانے کے لئے بھی کچھ نہ ملا، جس آزادی کی خاطر اس کی اور اس کے دوستوں کی آرزوئیں جنم پا رہی تھیں۔ وہ آزادی اپنے ساتھ بربادی اور پشیمانی لائی تھی۔ انسانی خون ارزاں ہو گیا تھا۔ آباد بستیاں ویران ہو گئی تھیں۔ ہزاروں سالوں کی پرانی انسانی روایت بے موت مر گئی تھی۔ جن گھروں میں زندگی ناچ رہی تھیں وہاں اب موت کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ زندگی تڑپ رہی تھی۔ موت اپنے پر پھیلا چکی تھی، دھرم سنگھ اور اس جیسے بہت سے انسان زخمی فاختاؤں کی طرح اپنی زندگیوں کی آخری سانسیں ویرانوں میں گن رہے تھے۔ مگر دھرم سنگھ کی زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا تھا۔ رات کے بھیانک اندھیرے میں رحیم خان نے سہارا بن کر دھرم سنگھ کو بے وقت اور بے رحم موت

سے بچالیا تھا۔ دھرم سنگھ کو وہاں سے نکالنے میں رحیم خان نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے دھرم سنگھ کو یاد آ رہے تھے۔ یوں تو وہ خندق میں بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی تصور کی نگاہیں جوانی کی وادیوں میں گھوم پھر رہی تھیں۔

اتنا طویل عرصہ.........وقت کا یہ احساس دھرم سنگھ کو اس وقت ہوا جب اس نے اپنے چھوٹے سے بیگ سے آئینہ نکال کر اپنی صورت دیکھی۔ اس کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے۔ آج اتنی طویل مدت کے بعد حالات نے ایک عجیب سا رخ اپنا لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے ہی گاؤں میں زندگی اور موت کے درمیان کھڑا تھا۔ انسان پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے جواں ہوتا ہے اور پھر بڑھاپا اسے گھیر لیتا ہے اور ایک دن مر جاتا ہے لیکن یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں، پھلتی پھولتی ہیں۔ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی آج اس نے اپنے گاؤں کو اسی حالت میں پایا تھا جیسے وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہی لہلہاتی کھیتیاں تھیں، سرسبز گھاٹیاں تھیں، وہی پگڈنڈیاں تھیں، وہی راہیں تھیں، پہاڑی کے دامن میں وہی شور مچاتی ندی تھی، جہاں گاؤں کی گوریاں مدھر گیت الاپتی تھیں۔ دھرم سنگھ سوچ رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں کر ہوا کہ وہ اور اس جیسے لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے۔ اگر لہلہاتے کھیت اپنی صورتیں نہیں بدلتے تو پھر کیا وجہ ہے انسان کے خیالات بدل جاتے ہیں۔ اگر زمین کا رنگ ایک ہی ہے، ندی نالوں میں بہتے ہوئے پانی کی لے ایک جیسی ہے، درختوں اور پیڑوں کی چھاؤں میں ٹھنڈک ایک جیسی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رحیم خان سرحد کے پار اپنی زندگی گزار رہا ہے اور دھرم سنگھ سرحد کے اس پار کیوں اور کس لئے؟ دھرم سنگھ کو محسوس ہوا جیسے اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ اپنی ماں کی گود میں دبکا پڑا ہے......!

دفعتاً ایک دھماکہ ہوا گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی آگ پھیلتی گئی۔ افسر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دھرم سنگھ کے بہت سارے ساتھی مر چکے تھے۔ ہر طرف شور بپا تھا، ہر سمت دھواں بکھرا ہوا تھا۔ دھرم سنگھ کا سپاہی جاگ پڑا وہ بھی آگے بڑھا اور ایک خندق میں گھس گیا۔ وہاں پہلے ہی ایک سپاہی موجود تھا، دونوں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش

کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے پر بندوق چلانے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ ایک گولی چلی.......... پھر دوسری گولی چلی...... پھر بندوقیں خاموش ہوگئیں...... دونوں سپاہی ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کررہے تھے۔ دونوں زخمی تھے۔ خون بہہ رہا ہے اور پھر ایک آواز آئی...... دھرم سنگھ تم...... دوسری جانب سے بھی ایک آواز بھری...... رحیم خان تم......شاید اب دونوں کے درمیاں کوئی دیوار حائل نہ تھی!!

☆☆☆

☆......غلام محمد صوفی
(کشمیری سے ترجمہ: جان محمد آزاد)

رمضان بوڑھا

صُبح پھوٗل آفتابن ترٛ وو پرتوَ
تُلُکھ آغازِ جنگ ازسرِ نو!

(ایک نئی صبح نمودار ہونے کے ساتھ ہی آفتاب کی شعاعیں اُجالا کرنے لگیں لیکن اِس کے ساتھ ہی ایک بار پھر ایک نئی جنگ کا آغاز ہوگیا)

کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی یہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اِس آواز نے دیکھتے ہی دیکھے مجھے کسی اور دُنیا میں پہنچا دیا۔ اُس دنیا میں جو کہیں نہیں تھی۔ ایک ایسے عالم میں جہاں میں یہ ہر شام وسحر سُنا کرتا تھا۔ میں دروازے کے ساتھ بُت بنا اِس آواز کے سحر میں کھو گیا۔ ہاں یہ "رمضان بڑٕ" آیا تھا اور وہی یہ داستان سنا رہا تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔

"راوی کہتا ہے کہ آفتاب کے طلوع کے ساتھ ہی رُستم ایک بار پھر کشتی لڑنے کے لئے باہر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ آج تک رستم کبھی گھبرایا نہ تھا۔ اُس نے کیسے کیسے پہلوانوں کے چھکے چھڑا لئے تھے لیکن آج اُس کا سامنا ایک ایسے پہلوان سے تھا کہ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے آج بھی اسے نہ ہرایا تو میں منہ دکھانے کے لایق نہیں رہوں گا۔ رستم خدشات کے

بھنور میں گھبرایا ہوا تھا۔"

اتنا سُن کر میں مجلس کے سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی سارے لوگ حیران رہ گئے۔ وہ نہایت ذوق وشوق سے قصہ سن رہے تھے۔ رمضان بڈ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ قصے کو بھول کر دور ہی سے میرے ساتھ علیک سلیک کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ یہ رمضان بڈ وہ نہیں تھا جسے میں جانتا ہوں۔ ماہ وسال نے اُسے ضعیف ولاغر بنا کر رکھ دیا تھا۔ اُس کی پلکیں تک سفید ہو گیں تھیں۔ بڑھاپے نے اُسے گویا نگل کے رکھ دیا تھا۔ چہرے پر جھریوں نے جال سا بچھا دیا تھا۔ اگر اُس کی آواز سے میں مانوس نہ ہوتا تو غالباً میں اُسے پہچان بھی نہ پاتا۔ اُس کا لباس بھی نہایت بوسیدہ تھا۔ میں اُسے دیکھتا رہا ہے کیا یہ واقعی وہی رمضان بڈ ہے جس کے ہمراہ میرے شام وسحر گزرا کرتے تھے جو مجھے عجائبات کی سیر کراتا تھا۔ میں اُسے دیکھتا رہا اور آج سے اٹھارہ سال پہلے کی اُسی مانوس دنیا میں پہنچ گیا۔۔۔!

تب میری تبدیلی سوگام کردی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں کئی دن تک کسی مناسب ڈیرے کی جگہ کی تلاش کرتا رہا۔ یوں تو کئی ڈیرے دستیاب تھے لیکن میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں پر زیادہ ہنگامہ نہ ہو۔ لوگوں کی زیادہ ریل پیل نہ ہو۔ کافی تلاش وجستجو کے بعد بالآخر مجھے ایسی جگہ مل گئی۔ مجھے میرا ایک ساتھی وہاں لے کر آیا۔ یہ گاؤں سے ذرا فاصلے پر ایک چھوٹی سی ندیا کے کنارے پر ایک کٹیا سی تھی۔ باہر سے نہایت معمولی مگر اندر سجی ہوئی تھی۔

مجھے یہ چھوٹی سی کٹیا پسند آئی اور میں نے اس کے مالک، ایک معمر شخص سے رابطہ قائم کیا یہ شخص کوئی ستر سال کا رہا ہوگا۔ جب میں نے اِس سے یہ کہا کہ میں اُس کے ہاں ڈیرے پر رہنا چاہتا ہوں تو اُس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ نہیں صاحب، میں کسی کو اپنے ہاں ڈیرے پر نہیں رکھتا۔ میں مایوس ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر مجھے یہاں جگہ نہیں ملی تو اِس علاقے میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے اِس بزرگ شخص سے پھر کئی بار جا کر منت سماجت کی۔ آخر اُس کو میرے حال پر رحم آیا اور اُس نے مجھے رہنے کی اجازت دے دی۔ اب میں وہیں رہنے لگا۔

میں صبح کو نکل کر شام تک لوٹ آتا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ میں اپنے ہمراہ جو کتابیں لے آیا تھا اُن میں ناولوں کے علاوہ پرانی داستانوں پر مشتمل کتابیں بھی تھیں۔ شام کو اِن میں سے کوئی ایک کتاب اٹھا کر مطالعہ میں محو ہو جاتا۔ اِس بزرگ کا میرے پاس زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ اِس کی راتیں اکثر باہر ہی گزرتی تھیں۔ کبھی یہ نصف شب کو لوٹ آتا۔

خزاں کی ایک سہ پہر میں گھر سے باہر دھوپ میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ یہ بُزرگ آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ آج اس نے پہلی بار مجھ سے میرے حال احوال پوچھے۔ میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ میں نے اُسے اپنے بارے میں سبھی باتیں بتائیں۔ میں نے رمضان بڈ کو کبھی کام کرتے نہیں دیکھا تھا سو میں نے بھی اُسے پوچھا "بابا۔۔۔تم کرتے کیا ہو؟"۔ اُس نے کہا "میرا بھلا کیا کام ہے۔ بس دِن کو بیٹھے رہنا اور رات کو لوگوں کا دماغ چاٹنا!" میں نے اُس سے کہا "تو گویا تم گانے والے ہو" اُس نے بتایا، "بس ایسا ہی کچھ سمجھ لو۔ گاتا بھی ہوں اور داستانیں بھی سناتا ہوں!" جب میں نے حیران ہو کر یہ پوچھا کہ کون سے قصے سناتے ہو تو بوڑھے نے کہا "برخوردار! تم یہ اتنے حیران سے کیوں ہو گئے!"

میں نے کہا "دراصل میں خود کہانیاں لکھتا ہوں۔۔۔!" رمضان بڈ حیرت زدہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اِس گاؤں میں سرِ شام ہی چادر لپیٹ کر بیٹھ جانا پڑتا ہے۔ چراغ کی روشنی میں کتاب بھی نہیں پڑھی جا سکتی تھی۔ سو میں نے بہتر سمجھا کہ رمضان بڈ کی زبان سے ہی کچھ سنا جائے۔ میں آج تک صرف ناول پڑھتا رہا تھا اور مجھے اپنے کلاسیکی ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اب محض وقت کاٹنے کے لئے میں اِس جانب راغب ہوا۔

سو اِس دن شام کو ہم نے مجلس آراستہ کی۔ گاؤں کے بعض لوگ بھی آ کر شریک ہوئے۔ رمضان بڈ نے یوں شروعات کی۔

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

اِس کے بعد اُس نے داستان سُنانی شروع کی۔۔۔ "ایک بادشاہ گزرا ہے جس

کی سات بیٹیاں تھیں۔ کتنی تھیں۔۔؟''

''سات بیٹیاں'' سبھی نے یک زبان ہو کر دہرایا۔

یہ سات بیٹیاں سات محل خانوں میں رہتی تھیں۔ ہر محل خانہ ایک عجائب خانہ سا تھا۔ یہ جیسے ایک دوسرے کے پاس واقع تھے مگر حقیقت میں یہ ایک دوسرے سے کافی دور تھے۔ مگر فاصلوں کے باوجود یہ پڑوس میں ہی دکھائی دیتے تھے۔ پھر یہ ہے کہ ہر محل خانے کی شکل دوسرے سے واقعی مختلف تھی۔ کاریگروں نے اِن کی تعمیر میں ایسی فن کاری کا مظاہرہ کیا تھا کہ جس محل خانے پر بھی نظر پڑتی تھی تو صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ کس شہزادی کا ہے!

رمضان بڈ قصہ سناتا رہا اور سامعین کا اشتیاق بتدریج بڑھتا رہا۔ وہ کہانی سناتے سناتے کبھی خود بھی جوش میں آجاتا۔ جنگ کا سماں باندھتے ہوئے اُس کے بازو ہوا میں لہراتے۔

رمضان بڈ کی داستانوں کے زیادہ کردار جِنات، پریوں، شہزادوں اور بادشاہوں کے ہوا کرتے تھے۔ یہ کہانیاں سناتے سناتے پھر وہ کبھی کوئی گیت بھی چھیڑتا تھا۔ یہ گیت سنا کر وہ حقے کے دو تین کش بھی لے لیتا تھا اور پھر سے سننے والوں کو جنگلات، بیابانوں، محل سراؤں، سمندروں اور دریاؤں کے قصے سنانے بیٹھ جاتا۔ پھر جب وہ قصے کو دہرانے لگتا تو سننے والوں کا امتحان لینے کے لئے کہتا: ''تو کتنے محل خانے تھے بادشاہ کے!''

''سات'' سبھی یک بار چلا اٹھتے۔

اُس رات یہ داستان نصف شب کے بعد بھی جاری رہی۔ سبھی سننے والے سحر زدہ سے تھے۔ ہمہ تن گوش۔۔۔!

سوگام میں رہتے ہوئے اب کئی برس بیت گئے اور اس دوران رمضان بڈ اب میرے ساتھ گھل مِل گیا تھا۔ وہ میری فطرت سے پوری طرح آگاہ ہو گیا تھا۔ میں نے اِس دوران اُس کی زبان سے دو درجن داستانیں سُنی تھیں جو سبھی نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز تھیں۔

پھر موسم سرما میں چلہ کلان کے ایام تھے۔ رات کو بھاری برف باری ہوئی تھی۔ سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ اِن منجمد فضاؤں میں باہر نکلنا ناممکن تھا۔ نہ جانے کتنے دنوں

کے لئے یہ سلسلے جاری رہنے والے تھے۔ گاؤں میں دِن گزار نے بے پناہ دِقت طلب تھا۔ اِن ایام میں لوگ رمضان کو تلاشنے لگے۔ شام وسحر لوگ اُس کے گرد منڈلاتے رہے۔ یہ سبھی اُسے اپنے گھر لے جانے کے لئے جتن کرتے رہے۔ اِن ایام میں اُس کی زبان سے کہانیاں سُننے کا لطف ہی کچھ اور تھا!

میرا سارا دن بے کار گزرا تھا۔ چاہتا تھا کہ شام ہو جائے تا کہ میں اُس کی زبان سے کوئی قصہ سُنوں مگر گاؤں کے لوگ اُسے لے جا کر قصے کہانیاں سنتے اور میں یہاں اکیلا محروم رہتا۔ سو میں نے تنگ آ کر اُس سے کہا ''بابا! آج تم کسی بھی صورت میں گھر سے باہر نہیں جاؤ گے'' اُس کے لبوں پر ہنسی آ گئی ''برخوردار! میں بھلا اِس برف بار فضا سے کیا ڈروں گا۔ میں نے نہ جانے ایسی کتنی زمہریر راتیں باہر سفر میں گزاری ہیں۔!'' میں نے کہا ''بابا تم نے اپنی زندگی میں ایسے نہ جانے کتنے مراحل طے کئے ہیں۔ لوگوں کو اپنی کہانیوں سے محظوظ کرتے رہے ہو۔ ذرا آج ہمیں اپنی کہانی سناؤ۔!'' رمضان بڈ جو کہیں نکلنے کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ یہ سُن کر سنبھل کر بیٹھ گیا ''بھئی آج کئی لوگوں کے ساتھ مِل بیٹھنے کے لئے پیشگی بھی لے چکا ہوں مگر اب تم اصرار کرتے ہو تو میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آج کی رات میں بس یہیں گزاروں گا۔'' میں خوش ہوا آج تک میں نے کئی بار یہ ارادہ کر لیا تھا کہ رمضان بابا سے اُس کی اپنی کہانی جان لوں لیکن کبھی اتنی مہلت نہیں ملی۔

بابا نے رات کو سبھی کے سامنے روایتی کہانی کی طرح اپنی داستان سنانی شروع کی۔

''دچھن پور علاقے میں ایک شخص رہتا تھا۔ اسے لوگ محمد قبالہ، کے نام سے جانتے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ فریب کاری سے لوگوں کی زمین ہتھیا کر اِس پر اپنا قبالہ یعنی قبضہ کرتا تھا۔ اِس طرح اُس نے لوگوں کی پانچ چھ سو کنال زمین پر اپنا قبضہ کر لیا تھا جسے وہ کاشت کاروں کو دے کر اِس پر فصل اُگاتا تھا۔ یہ ساری فصل وہ اپنے مصرف میں لاتا تھا حالانکہ اُس کا کنبہ صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ وہ، اُس کی بیوی اور دو بیٹے۔ محمد قبالہ میں ایک خوبی تھی کہ وہ حاجت مندوں کی دِل کھول کر مدد و اعانت کرتا تھا۔ اُس کے پاس غلے کا

جتنا بھاری ذخیرہ موجود ہوتا تھا وہ اِسے فراخ دِلی سے لوگوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اُس نے گاؤں میں ایک مکان تعمیر کرایا تھا۔ یہ وسیع وعریض تعمیر اُس نے مسافروں کے لئے وقف رکھی تھی۔ اِس گاؤں میں آس پاس کے دیہات سے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایسے ہی ضرورت مندوں کی مشکلات کا ازالہ کرنے کے لئے محمد قبالہ نے یہ بڑا سا مکان تعمیر کرایا تھا۔ وہ کسی بھی شخص سے کوئی بھی رقم نہیں لیتا تھا۔ محمد قبالہ نے اپنے بیٹے کو اِس عام رہائش گاہ کا نگران مقرر کیا تھا۔ شام کو اطراف سے آنے والے دیہاتی مل بیٹھ کر ایک دوسرے کو قصے کہانیاں سناتے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ جگہ گویا حکایات سننے کا ایک اہم مرکز بن گئی۔ اب لوگ وہاں زیادہ قصے کہانیاں سننے کے لئے آتے۔ دور دراز کے دیہات سے ذوق وشوق رکھنے والے درجنوں افراد یہاں کئی کئی دن ٹھہرتے۔ اِس کے لنگر خانے کا سارا خرچہ محمد قبالہ خود اٹھاتا تھا۔ وہ اِس میں تخفیف نہیں ہونے دیتا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ یہ جگہ پناہ گاہ سے زیادہ داستانیں سُننے سنانے کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کرگئی۔ چنانچہ یہاں بعض ایسے لوگ مقیم ہوگئے تھے جو محض کہانیاں سننے اور پھر انہیں یاد کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی ذات گویا داستانوں کی ایک کائنات بن گئی تھی۔ اِس جماعت میں ایک شخص کی حیثیت اُستاد کی سی تھی۔ اِس کا نام رمضان تھا اور یہ مومہ قبالہ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اِس کے ذمہ چونکہ لنگر خانے کی نگرانی کا کام تھا لہٰذا اِس کے شب وروز یہیں گزرتے تھے۔ ایک چوتھائی صدی تک مسافر خانے اور لنگر خانے میں اِسی طرح لوگوں کا آنا جانا لگا رہا لیکن محمد قبالہ کے فوت ہوجانے کے بعد اُس کے بڑے بیٹے سونہ قبالی نے مُسافر خانے اور لنگر خانے کے اخراجات بند کردیئے ساری محفلیں خواب ہوگئیں۔ سونہ قبالی اب اپنے زراعت کا تجارتی استعمال کرنے لگا۔ رمضان نے اپنے بھائی کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی اور کہا ''سونہ! یہ لنگر بند مت کرو۔ یہ ساری زراعت اِسی کی خیرات ہے!'' لیکن سونہ نے اُس کی بات کو یکسر نظر انداز کردیا۔ اب رمضان اپنے حصے سے ہی لنگر خانے کو چلاتا لیکن جائیداد میں اُس کا کوئی حصہ نہیں بنتا تھا کیونکہ وہ مُمہ قبالی کی بیوی کا بیٹا تھا۔ ابھی

چند ہی سال گزرے تھے کہ سونہ قبالی پر رب کا قہر نازل ہوا اور سرکار نے اعلان کیا کہ اب زمین کاشت کار کی ہے۔ چنانچہ ممہ قبالی نے ماضی میں جو زمین فریب اور دھوکے سے ہتھیالی تھی اُس پر کاشتکار کا قبضہ ہوگیا۔ سونہ قبالی بس دیکھتا رہ گیا۔ کل کا شاہ آج گویا گدا گر ہوگیا تھا۔۔۔!

رمضان یہ سب دیکھ کر وہاں سے بھاگ گیا اور مختلف دیہی علاقوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ اس آوارگی کے دوران وہ لوگوں کو قصے کہانیاں سناتا۔ اُس کی زبان سے قصے سننے کے لئے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے۔ اُس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

پھر ایک دِن وہ برنگ کے علاقے میں آنکلا۔ لوگ جوق در جوق آکر اُس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ وہاں ایک جشن کا سا سماں بند گیا۔ رمضان سے شائقین داستان سننے کی فرمائش کرنے لگے۔ لیکن اسی دوران وہاں ایک اور شخص بھی آگیا جو رمضان کی ہی عمر کا تھا۔ اُس نے اجتماع میں کھڑے ہوکر کہا کہ رمضان کوئی ایسی طویل داستان سنائے جو کئی دِنوں تک ختم نہ ہو۔ اگر وہ تیار ہے تو وہ سنانی شروع کرے اور اگر وہ تیار نہیں ہے تو وہ بیٹھ جائے اور میں یہ داستان خود سنانی شروع کروں گا۔'' اس پر رمضان بیٹھ گیا اور اُس شخص نے اپنی داستان خود سنانی شروع کی۔ وہ شخص دس راتوں تک یہ داستان سناتا رہا اور لوگ اشتیاق سے سنتے رہے۔ دس دنوں کے بعد رمضان نے اُس شخص سے مخاطب ہوکر کہا:

''اے میرے ہم عصر داستان گو! تم نے دس راتوں تک اپنی داستان سنائی اور کمال کردیا۔ مگر اے میرے دوست! مجھے ایسی طویل ترین داستانیں بھی یاد ہیں جو ایک مہینے کے بعد بھی ختم نہیں ہوں گی!'' پھر اُس نے اپنی داستان سُنانی شروع کی۔ اُس کے معتقد ہمہ تن گوش ہوگئے اور یہ داستان پنتیس دِن تک جاری رہی۔! اُس کا حریف شرمسار ہوگیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ اِس صنف میں اُس کی حیثیت ابھی طالب کی سی ہے اور اُس نے رمضان کو اپنا استاد تسلیم کرلیا!۔

وادی کشمیر کے اطراف واکناف میں گھومنے پھرنے کے بعد بالآخر اُس نے سوگام

میں سکونت اختیار کی۔ اُس نے اپنے مداحوں کی اعانت سے زمین کے کچھ کنال حاصل کیئے۔یہیں اُس نے ایک جھونپڑی سی تعمیر کی اور اِسی میں ماہ وسال گزارتا رہا۔۔۔!۔

رمضان بڈؕ کی یہ ساری آپ بیتی سُن کر میں نے نہایت عقیدت کے ساتھ کہا تھا۔۔''بابا! تمہاری یہ کہانی سن کر بصیرت کی نئی راہیں روشن ہو جاتی ہیں!''

آج سولہ سال بعد جب رمضان بڈؕ اور اُس کے قصے کہانیاں میرے لئے داستانِ پارینہ بن گئے تھے، اُسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ مجھے اپنا خزانہ سونپنے آیا ہے۔ وہ ایک لاٹھی کے سہارے تصویرِ خزاں کی طرح کھڑا تھا۔ وہ اب بینائی سے بھی محروم ہو چکا تھا گویا بس داعی اجل کو لبیک کہنے والا ہو۔ میں ششدر رہ گیا۔ اُس کی حیثیت ایک طلسم خانے کی سی تھی۔ ایک خزانے کی سی تھی۔ ایک ایسے خزانے کی جو نایاب ہے جس میں ایسے گوہر شاہوار ہیں جو ہر زمانے میں عدیم النظیر رہیں گے۔!

☆...... صوفی غلام محمد
(کشمیری سے ترجمہ: اسد اللہ اسد)

مالا بی بی

مالا بی بی آج تقریباً ایک ماہ بعد بازار میں آگئی۔ اُس کی آمد سے گویا بازار میں رونق آگئی۔ ہر دوکاندار، ہر ایک بیوپاری اور بازار کا ہر گاہک فقط مالا بی بی کی طرف ٹکٹکی لگائے تھا۔ سب اس کو مبارکباد دے رہے تھے۔ ''مالا بی بی! خیر تو ہے؟ مالا بی بی! ٹھیک ٹھاک ہو؟ مالا بی بی آج تک کہاں چھپی بیٹھی تھی؟ مالا! آج خوب ہٹی کٹی ہوگئی ہو!''

کچھ دکاندار تو دوکان میں بیٹھے بیٹھے ہی مالا بی بی سے خیر و عافیت پوچھتے تھے اور کچھ دکانیں چھوڑ کر حلقہ باندھے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ سب لوگ اُس سے استفسار کر رہے تھے کہ وہ اتنی دن تک کہاں تھی۔ وہ تو آج برابر ایک ماہ بعد پھر سے بازار میں نمودار ہوگئی تھی۔ مالا بی بی مُسکراتے ہوئے ہر کسی کی مزاج پُرسی کا جواب دے رہی تھی۔ وہ اِس ایک مہینے تک کہاں تھی اور اُس نے اتنی مدت تک شہر آنا کیوں چھوڑ دیا تھا، اس بات کا وہ کچھ جواب نہیں دے رہی تھی۔ بازار والے تو اِس بات سے واقف تھے کہ مالا بی بی کہاں تھی اور اس کے شہر نہ آنے کی وجہ کیا تھی، مگر پھر بھی وہ اس سے یہی ایک سوال پوچھتے تھے کہ وہ کہاں تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مالا سے یہ سوال پوچھنے پر اس کی کمزور رگ دُکھتی ہے۔ مالا بی بی یہی کوشش کیا کرتی تھی کہ وہ اِس بات کا جواب نہ دے۔ اسی سبب ادھر اُدھر کی

ہانک کر اس سوال کو ٹال رہی تھی۔ مگر بازار والے بھی کیا کم تھے؟ وہ تو اِدھر اُدھر کی ہانک کر پھر اپنے اصل مدّعا پر آجاتے۔ اُبلتی ہانڈیوں کو ڈھکن بند کر کے تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش کیا جاسکتا ہے مگر عام لوگوں کی زبان خاموش کرانا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ایک، دو یا تین اشخاص ہوتے تو مالا بی بی ان کو علاحدہ طور سے جواب دیتی مگر بازار کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک چالیس دُکاندار موجود تھے جن کے مُنہ بند کرانا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک طرف سلام سویاں والا اس کو اشتعال دیتا تو دوسری طرف حبیب دھنیا طعنے کَستا تھا۔ مامہ بِساطی دکان پر ہی دھاگے کی تار کو قلاوے پر مروڑتا، بل دیتا ہوا گاہے گاہے مالا بی بی کی طرف بھی آوازیں کَستا۔ ''مالا! تو کہاں تھی؟ قسم خدا کی، آج تو میم صاحبہ لگتی ہو!''۔

مامہ بساطی تو بازار کا بزرگ ترین دکاندار تھا، اسی باعث باقی دکانداروں کو اس کی بزرگی کا پاس تھا۔ مگر جب بھی دکاندار تمسخر پر اُتر آتے تو اس وقت عمر کو بالائے طاق رکھ دیتے۔ مامہ بساطی بھی مالا بی بی کو ''ہیے'' پُکار کر یاد کیا کرتا تھا۔

مالا بی بی چپ سادھ لئے ان باتوں کے تمسخرانہ رمز واشارات کو بھانپتی اور سن لیتی تھی اور کسی سے کچھ نہ کہتی۔ اگر موقعہ کی نزاکت اِس کے برعکس ہوتی یا اگر اور کوئی بات ہوتی، وہ تو ان کو کھری کھوٹی سُنا دیتی۔ جب بھی مذاق ومخول پر اُتر آتی، وہ مامہ بساطی جیسے بزرگ دکاندار کا بھی کوئی لحاظ نہ کرتی۔ قادر قصاب تو فتنہ پرور مانا جاتا تھا مگر وہ بھی مالا بی بی کی ضد اور شرارت سے کبھی کبھی پناہ مانگتا تھا۔ مگر آج مالا بی بی کی زبان گویا شرم وحیا کے مارے حلق میں ہی اٹک گئی تھی۔

مالا بی بی بٹہ پورہ کی بقالن تھی اور یہ گاؤں شہر سے چار، پانچ میل دور تھا۔ اگر چہ اُس کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر گئی تھی مگر پھر بھی وہ جوان دکھائی دیتی تھی۔ قادر قصاب اس کو کہا کرتا: ''اگر چار بچوں کی ماں ہو کے بھی تجھے ڈولی چڑھایا جائے تو بھی کوئی تمہیں بچوں والی نہ سمجھے گا۔''

اگر چہ مالا بی بی کے متعلق قادر قصاب کے یہ خیالات حقیقت سے بعید تھے مگر اس

میں یہ بات ضرور تھی کہ وہ ابھی تک بہت حسین و جمیل تھی۔ وہ ایک اُستوار جسم کی مالک تھی اور اُس کے بھرے بھرے چہرے، اس کی مضبوط بانہوں اور موٹی پنڈلیوں کی بنا پر اس کی ہم پیشہ سہیلیاں اس کو مالا سانڈنی کے نام سے پکارتی تھیں۔ وہ صرف اِسی صفت کی مالکہ نہ تھی کہ اس کا چہرہ بھرا بھرا اور حسین تھا اور اس کا جسم مضبوط تھا بلکہ اس کی شیریں زبانی اس کی ایک بڑی خوبی تھی جس کی وجہ سے وہ تیس سیر ساگ کی ٹوکری آناً فاناً بیچ دیتی تھی۔ اگرچہ وہ ساگ بیچنے کے لئے شہر آجاتی تھی مگر وہ اپنی سبزی کا بیشتر راستے ہی میں بیچ دیتی۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل کر ٹوکری کی سطح سے بہت اوپر تک ساگ کو تہہ دے کر لے آتی اور رستے میں اپنے گاہکوں کو ساگ مہیا کر دیتی جو الگ الگ محلوں کی ہوا کرتی تھیں اور الگ الگ طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایسے گاہکوں میں کچھ ایسی بیبیاں بھی تھیں جو مالا بی بی سے گھروں میں ہی ساگ خرید لیتی تھیں جو خود کو حیا والیاں تصور کرتی تھیں اور اپنے خاوندوں کے سوا غیر محرم اشخاص کو اپنا چہرہ دکھانا تک گناہ سمجھتی تھیں۔ مالا بی بی اِن خواجہ زادیوں، آپاؤں اور سیدانیوں کو فرداً فرداً جانتی تھی۔ اس کا ایسی عورتوں کے ساتھ بھی مِلنا جلنا تھا جو عام نکڑوں، سڑکوں اور گلیوں میں عام مردوں کے ساتھ گھوما پھرا کرتی ہیں۔

مالا بی بی کے لین دین کا طریقہ عجیب تھا۔ وہ دیگر سبزی فروش عورتوں کی طرح اپنی طرف سے آواز نہیں دیتی اور نہ اپنے ساگ کی تعریفیں کرتی۔ اس کا خیال تھا کہ جس گاہک کو ایک بار سبزی بیچی جائے، وہ دوسرے دن اس کو خود پکارے اور اس کے ساگ کی تعریفیں کرے۔ گھر سے نکل کر ہی شہر پہنچنے تک اُسے ہر دروازے سے بُلاوے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اگر کسی دن کوئی عورت اُسے ساگ خراب ہونے کی شکایت کرتی، مالا بی بی اُسے اس طرح سے جواب دیتی کہ وہ خاموش ہو جاتی۔

''دیدی تُم تو ساگ کھانا ہی نہیں جانتی؟ اگر میرے ساگ کو سلیقے سے پکانا آئے تو تمہارے ہونٹ ساگ کی لذّت کو پہچان جائیں گے۔''

''نا بی بی، نا! کیا میں نے تمہارے ساگ کو نہیں پکایا ہے؟''۔ اگر تو نے اِسے پکایا

ہوتا تو یہ اناپ شناپ نہ بکتی۔ دیکھ، ناراض مت ہونا! ساگ پکانا وہ ہوتا ہے کہ اِسے پانی میں ابالا جائے، اِس میں مصالحہ جات ڈالے جائیں، تیل ہونا چاہیے اور یہ ہو کر بھی اگر پکانے والی ٹھیک نہ ہو تو بھی اس کا سواد ہی جاتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں ساگ، ساگ نہیں رہتا بلکہ یہ مویشیوں کے گھاس پھوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

مالا بی بی نہ صرف اپنے کاروبار اور کسب و ہنر میں پہچانی جاتی تھی بلکہ جس طرح وہ اس بات سے واقف تھی کہ کِس ساگزار سے کس قدر زیادہ فصل اُگتی ہے، کِس زمین میں بیج بو کر ساگ میٹھا اور پُر لذّت بن جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اِس بات سے بھی شناسا تھی کہ کِس گاہک کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرنا چاہیئے۔ وہ تو بڑوں کے ساتھ بڑا پن اور بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح ہی پیش آتی۔ مردوں کے ساتھ مل کر مردانہ پن دکھاتی اور عورتوں کے ساتھ مل کر عورت ہی لگتی۔ عالی وقار لوگوں کے گھر میں داخل ہو کر شُستہ زبان ہی اختیار کر لیتی اور جھگڑالو لوگوں سے مل کر ستیزہ جُو ہی بن جاتی، مگر بے شمار گاہک ہوتے ہوئے بھی کوئی بھی گاہک اُس سے نرخ کی ہیرا پھیری کی شاکی نہ تھی۔

مالا بی بی کے اِس یکساں اصول اور برتاؤ کے رویّے نے اس کے گاہکوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب وہ گاہکوں کو ساگ بیچ کر بازار میں آجاتی تو بازار کی رونق دوبالا معلوم ہوتی۔ یوں تو بازار میں ہر قسم اور ہر پیشہ کے دوکاندار موجود تھے اور دوکانوں میں سینکڑوں، ہزاروں کا مال و متاع تھا مگر مالا بی بی کی اپنی کوئی دکان نہ تھی۔ اُس کا اثاثہ وہی ساگ کی اِک ٹوکری تھی جسے وہ اپنے سر پر کپڑے کے ایک مروڑے ہوئے لتھڑے کا سہارا دے کر گھر سے شہر اور پھر شہر سے گھر واپس لے جاتی تھی۔ مالا بی بی گویا تو اِس بازار کی جان تھی۔ نہ بہ مسگر کی دکان کی ایسی اہمیت نہ تھی جس قدر وقعت مالا بی بی کے ساگ کی ٹوکری کی تھی، جس کے ارد گرد خریداروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جوں ہی وہ بازار میں وارِد ہوتی تو دکاندار اس کے ساتھ ٹھٹھ مسخری کا آغاز کرتے اور وہ ہر تمسخر کا جواب تمسخرانہ انداز سے ہی دے دیتی۔

''مالا! آج تمہارا چہرہ نہ جانے کیوں سُرخ لگ رہا ہے۔''

''کیوں نہ ہو صاحب؟ تمہاری طرح کیوں روکھی سوکھی جیوں؟ جس میں شباب ہو، وہ کیونکر نہ گلاب ہو۔''

مالا جوانوں کے ساتھ بھی اُسی قدر اُلفت رکھتی تھی جس قدر کہ بوڑھوں کے ساتھ۔ اس کے ساگ کی ٹوکری کے اردگرد بیس سالہ نوجوان بھی موجود رہتے جو اُسے بار بار کہہ دیتے: ''ہائے! کاش تو کوئی ایکٹرس ہوتی تو مدھوبالا اور نرگس کو بھی پیچھے لتاڑ دیتی۔'' داڑھی والے بوڑھے بھی مالا بی بی کے ساتھ ہنستے کھیلتے تھے۔ وہ تو بوڑھوں کی بھی سُنتی اور چھوٹوں کی بھی سہہ لیتی۔ ہر کسی کو وہ خوش دیکھنا چاہتی اور کوئی بھی اُس کے پاس سے دل برداشتہ ہوکر نہ نکلتا۔ مگر مالا بی بی کی یہ مقبولیت دیگر سبزی فروش عورتوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جس قدر کہ وہ دوکانداروں، خریداروں اور عام لوگوں کو پیاری اور عزیز تھی اُسی قدر وہ اپنی ہم پیشہ کاروباری سبزی فروش عورتوں کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ وہ تو دِن کے چاروں پہر اُسے بددعائیں دیتی تھیں، مگر ان کی بددعائیں مالا بی بی اور اس کے کاروبار پر بے اثر ثابت ہوجاتیں۔ اس کے خلاف جادوٹونا بھی چلائے جاتے اور اُس کے ساگ کی ٹوکری پر بُرے اثرات والے تعویز بھی آزمائے گئے۔ اُس کے پیروں تلے کی مٹی پر بھی جھاڑ پھونک منتر کرائے گئے اور جادو کیا گیا مگر پھر بھی کوئی جادو، سحر یا تعویز کارگر ثابت نہ ہوتا۔ خریداروں میں اس کی بدظنی پھیلائی گئی۔ جن عالی وقار گھروں میں وہ آیا جایا کرتی، اُنہیں اِتنا تک کہا گیا کہ مالا بدکردار اور بدمعاش ہے، اس کی نظر خراب ہے، مگر اِس سے بھی مالا بی بی کے ہاتھ سے کوئی خریدار نہ چھٹ سکا۔ ہرچند کہ مالا بی بی نے ساگ کے بارہ گچھے (بنڈل) ایک ایک آنہ کے عوض بیچنے شروع کئے اور شرارت کی بنا پر دیگر سبزی فروش عورتوں نے پندرہ بنڈل بیچ دینے شروع کئے اور بنڈل میں ساگ کے پتوں کی تعداد بھی بڑھائی گئی اور ایسی چیزیں مالا بی بی کے خلاف آزمائی گئیں مگر پھر بھی وہ آگے ہی بڑھتی گئی۔ جب بھی مالا کسی خریدار کے ساتھ گفتگو میں محو ہوجاتی تو باقی سبزی فروش عورت جل اُٹھتی تھیں۔ وہ ایک

دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنے دلوں کی کدورت دور کرنے کی خاطر یوں کہہ اُٹھتیں:

"دیکھ کتنی بے غیرت اور بے حیا ہے یہ۔ اِس نے تو ہمارا نام ہی بدنام کر ڈالا ہے؟ دیکھ کس طرح اپنے عاشق سے باتیں کر رہی ہے۔"

مالا بی بی نے بازار میں بیٹھنے کے لئے ایک دوراہے کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں سے بازار کے دونوں اطراف پر نظر پڑتی تھی۔ آگے اک کوچہ تھا جہاں سے محلے بھر کی عورتیں مالا بی بی کے پاس آتی تھیں۔ یہ جگہ باقی سبزی فروش عورتوں کی آنکھ میں کھٹکتی تھی اور اسی باعث کئی بار اس کے ساتھ لڑنے جھگڑنے پر اُتر آتی تھیں کہ وہ وہاں نہ بیٹھے۔ ان کا مقصد تھا کہ وہ اِس جگہ سے ہٹ جائے تو وہ نصف سے زیادہ خریداروں سے ہاتھ دھو بیٹھے گی مگر مالا بھی کچھ گھونگی نادان تو نہ تھی کہ اِس جگہ کو چھوڑ دیتی۔ اگر کسی وقت وہ اپنی ہم پیشہ کاروباریوں سے لڑتے جھگڑتے کمزور پڑ جاتی تو سارے بازار والے اُس کی پُشت پناہی کرتے۔ ایک بار کمیٹی کا جمعدار بھی اس کے پاس آیا جس کو باقی سبزی فروش عورتوں نے چندہ جمع کر کے کچھ رقم دے رکھی تھی تا کہ وہ اُسے وہاں سے اٹھائے۔ جب جمعدار نے مالا بی بی سے کہہ دیا کہ وہ وہاں گندگی پھیلاتی ہے، لہٰذا کسی دوسری جگہ پر ساگ بیچے تو وہ بھانپ گئی کہ اس کو کن لوگوں نے اکسایا ہے۔ چونکہ یہ خریداروں کو ساگ بیچنے کا مخصوص وقت تھا تو مالا نے جمعدار سے اس وقت معافی مانگی کہ وہ کل وہاں نہ بیٹھے گی، مگر اس نے معاملہ کل پر نہ چھوڑا اور جمعدار کو ایک طرف لے کر اُس کے ہاتھ میں اُٹھنی (آٹھ آنے) تھما کر کہہ دیا "محض دوسروں کے کہنے پر چلتے ہو۔ لو سگریٹ پیو اور آئیندہ تنگ مت کیا کرو۔" اسی بات اور اُٹھنی کے اثر نے جمعدار کے غرور کو توڑ کر موم بنا دیا اور اس کے بعد اس نے کبھی بھی اس کو گندگی پھیلانے کی شکایت نہ کی۔

سبزی فروش عورتوں نے جتنے بھی ہتھیار مالا کے خلاف استعمال کئے، سب کے سب بیکار ثابت ہوئے مگر جس طرح درخت پر بار بار پتھر مارنے سے کوئی نہ کوئی ثمر پر لگ ہی جاتا ہے اُسی طرح سبزی فروش عورتوں کی ایک بات اس پر کارگر ہو ہی گئی۔ ایک دن مالا

بی بی کے خاوند (کریم بقال) سے یہ کہا گیا کہ مالا گھر سے نکل کر اپنے عاشقوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔ پہلے تو یہ بات کریم بقال پر بے اثر ثابت ہوئی مگر جب کئی عورتوں نے بات دہرائی تو وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ سبزی فروش عورتوں نے اُسے کہہ دیا کہ قادر قصائی کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ قادر قصاب کا نام اس بنا پر دیا گیا کہ مالا اُسی سے گھر کے لئے گوشت خرید کر لاتی تھی۔ اس کے علاوہ قادر قصاب بازار میں سب سے زیادہ جواں اور خوبصورت دکاندار تھا جو مالا کے بازار میں آنے جانے کے موقعہ پر ٹھٹھ بازی کرتا تھا۔ سبزی فروش عورتوں کی باتوں کو پرکھنے کی خاطر کریم بقال نے اپنی بہن کو بھی ساگ بیچنے کی خاطر بھیج دیا۔ اِس دن بھی قادر قصائی نے مالا بی بی کے ساتھ ہنسی مذاق کی مگر اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی نند کیا کرنے شہر آئی ہوئی ہے۔ اگر اس کو اس بات کا علم ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اِس دن دوکانداروں سے اُس طرح ہم کلام نہ ہوتی جس طرح وہ معمولاً ہوتی تھی۔ مالا کے لئے یہ دن بازار آنے کا آخری دن تھا۔ دوسرے دن جب اس کے برعکس اُس کا شوہر بازار میں ساگ کی ٹوکری لے کر آیا تو دکاندار ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آج تو مالا بی بی کے بدلے اس کی جگہ دوسری سبزی فروش عورت نے لے لی ہے۔ جو خریدار مالا بی بی کے انتظار میں تھے وہ بھی دھنگ رہ گئے۔

"مالا بی بی کہاں ہے؟ آج وہ کیوں نہیں آئی؟ خیریت تو ہے؟"

بازار میں ہر طرف یہی باتیں ہو رہی تھیں اور بازار بہت ہی بے رونق اور افسردہ سا لگ رہا تھا۔ آج تو بازار بالکل مندہ اور خالی سا لگ رہا تھا۔ کریم بقال بھی اس بات کا اظہار نہ کرتا تھا کہ وہ کیوں خود آ گیا۔ وہ چور نگاہوں سے دکانداروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کو وہ اپنے دشمن جیسے لگ رہے تھے۔ جب قادر قصاب تختے پر چھری سے گوشت کی بوٹیاں کاٹتا تھا تو اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ چوٹیں اس کے سینے پر لگ رہی ہیں۔ جو بھی خریدار آجاتے وہ اُس جگہ پر جہاں پر مالا بیٹھتی تھی نظریں ڈال کر دوسری سبزی فروش عورتوں کی طرف رُخ کرتے۔ آج تو اِن سبزی فروش عورتوں نے مدّتوں بعد گاہکوں کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ خوش تھیں۔ اپنی

چالا کی پر اِترا کر کبھی وہ دوکانداروں کو تاکتی اور کبھی کریم بقال کو دیکھتیں۔

کریم بقال کا یہ خیال کہ جو خریدار اس کی بیوی سے ساگ خریدتے تھے اُس کی جانب رجوع کریں گے، بالکل غلط ثابت ہوا۔ پہلے دن تو جوں توں اُس نے سالم ساگ کی ٹوکری بیچ ڈالی مگر دوسرے دن نصف سے زیادہ ساگ واپس گھر لے آیا۔ مالا بی بی کے گاہک ایک ایک کر کے بھاگ گئے۔ جو سبزی فروش عورتیں صبح سے شام تک بازار میں سوختہ جایا کرتی تھیں، اب اُن کی جیت ہی جیت تھی۔ جو راشی مالا کے گھر آتی تھی اس سے تو اب دوسری سبزی فروش عورتوں کی جیب بھر جاتی تھی۔ اگر آج کوئی کریم بقال سے سبزی خریدتا تو دوسرے روز اس کی جانب دیکھتا تک نہ تھا۔ جو بھی شخص اس کے پاس آتا، وہ اسے مالا بی بی کے ساگ کی تعریفیں کرتا اور وہ حیران رہ جاتا۔ وہ بھی وہی ساگ بیچتا تھا جو مالا بی بی بیچتی تھی مگر وہ اتنا سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے یہاں آنے سے ساگ کیوں کر بے مزہ ہوا۔ وقت گزرتا گیا، کریم بقال کی خریداری میں کمی ہی کمی ہوتی گئی اور آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ ساگ کی ٹوکری کو واپس گھر لے آیا جس طرح سے اس نے یہاں سے وہاں لائی تھی۔ کریم بقال کے لئے شہر آنا سودمند ثابت نہ ہوا۔ وہ محض اپنی بیوی کو غیرت مندی دکھانے کی غرض سے شہر آیا کرتا تھا۔ اسی اکڑ پن نے اس کو بہت نقصان پہنچا دیا۔ اب تو کریم بقال مہینے میں اتنا ساگ نہ بیچتا تھا جتنا کہ مالا بی بی ایک دن میں فروخت کرتی تھی۔ وہ نقصان پر نقصان اٹھانا برداشت کر رہا تھا مگر آخر کار کتنی دیر تک؟ ہر ایک چیز کی حد ہوتی ہے، آخر کار وہ کتنی مدّت تک بے جا غیرت مندی دکھا کر اپنی ٹانگوں پر کلہاڑی مارتا۔ ایک دن تھکا ماندہ گھر پہنچا اور ساگ کی ٹوکری جوں کہ توں تھی۔ آہ بھر کر اپنی بیوی سے کہہ دیا:

''بلا اِس سبزی کے کاروبار پر! میں تو مزدوری ہی کروں گا، مجھے اس سے کوئی فائدہ نہ ملا۔''

''کیوں نہ کچھ حاصل ہوا؟ جبکہ دوسروں کو حاصل ہوتا ہے، تجھے کیوں نہیں؟''

''ایسا کچھ تو معلوم نہیں۔ میرا ساگ تو لوگوں کو دھتورہ سا لگتا ہے''

یہ سن کر مالا بی بی نے ہنستے ہوئے اپنے شوہر سے کہا:

''بازاروں میں وہی لوگ آیا کرتے ہیں جو مرد ہوں۔ نامرد لوگ بازاروں میں پھرا نہیں کرتے۔'' یہ سن کر کریم بقال اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ''کیا میں نامرد ہوں؟''

''پھر ہو کیا؟'' جو شخص عورتوں کی باتوں پر کان دھرے وہ اور کیا ہے؟

''کیا وہ سب کچھ جھوٹ ہے جو میں نے سُنا ہے؟''

''جھوٹ نہیں تو اور کیا؟ میں اپنا کاروبار چلانے کی خاطر لاکھوں لوگوں کے سامنے سے گزرتی ہوں مگر کسی کا گمان تک نہ کرتی ہوں۔ کاروبار کرنا کوئی مذاق نہیں۔ یہ بچوں کا کھیل تماشا نہیں۔ جو عورت کاروبار کرنے نکلتی ہے وہ انگاروں پر سے چلتی ہے۔''

بیوی کی یہ باتیں سن کر اچانک کریم بقال کی گردن جھک گئی اور اُس کو اپنا وجود اپنی زوجہ کے آگے گنہگار دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنی بیوی سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان نہ جانے کیوں گلے میں اٹکی جارہی تھی۔

بتا اب کیا سوچ رہے ہو! میں تو اتنا جانتی ہوں کہ تُم کہنا کیا چاہتے ہو؟ جو کچھ بھی اب تک ہوا، سو ہُوا۔ مجھے اجازت دو کہ میں کل صبح پھر ساگ لے کر بازار جاؤں، دیکھتے ہیں کہ خُدا کو کیا منظور ہے۔

کریم بقال چُپ رہا۔ چُپ رہنے کا مطلب ہی اس بات کا اظہار تھا کہ اُس نے اُس کو جانے کی اجازت دے دی۔

دوسری صبح مالا بی بی پھر سے اُسی طرح ساگ کی ٹوکری سر پر اٹھائے شہر کی طرف روانہ ہوئی اور پھر سے مالا بی بی کی آواز بازاروں، کوچوں اور سڑکوں پر سنائی دینے لگی اور عورتیں کھڑکیوں سے جھانکنے لگیں۔

''مالا بی بی! مبارک ہو۔ مالا بی بی، مبارک ہو!''

عالی وقار بیبیاں اور آپائیں دروازوں کی آڑ سے مالا بی بی کی جانب جھانک رہی تھیں۔ وہ بھی اُسے دیکھ کر باغ باغ ہورہی تھیں۔

جوں ہی مالا بی بی بازار میں وارد ہوئی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک شور وغل مچ گیا۔

''مالا بی بی آ گئی! مالا بی بی آ گئی! مالا بی بی، مبارک!''

مالا کے آنے سے بازار میں پھر سے گویا جان آ گئی اور جو کمی مالا بی بی کے جانے سے پیدا ہوئی تھی، وہ پوری ہوئی۔

''مالا بی بی! تو کہاں تھی؟''

''مالا بی بی! خیریت سے ہو؟''

سب لوگ تو یہ جانتے تھے کہ مالا بی بی کہاں تھی اور وہ کیوں ساگ ۔ لے کر بازار نہیں آتی تھی۔ مگر پھر بھی سارے لوگ اُس سے یہ پوچھ لیتے کہ وہ کہاں تھی۔ مالا بی بی کے چہرے پر گویا حیا کا پردہ حائل تھا اور وہ اپنی زباں سے کہنے سے قاصر تھی کہ وہ کہاں تھی۔ برتنوں کے دہن تو ڈھکن سے ڈھانپے جاسکتے ہیں مگر لوگوں کے مُنہ بند نہیں کرائے جاسکتے ہیں۔ ایک طرف سلام سوئیاں والا اِس پر طعنے کستا تو دوسری طرف حبیب دھنیا باتیں بناتا۔ وہ اپنی طرف سے اِدھر اُدھر کی ہانک کر اس بات کو ٹال دینا چاہتی تھی، مگر کتنی دیر تک؟ قادر قصاب ابھی تک کسی گاہک کو گوشت دینے میں مصروف تھا مگر اب وہ بھی مالا بی بی سے کہنے لگا:

''مالا! آج تم اور بھی جوان لگتی ہو۔''

یہ سن کر مالا بی بی بے تاب ہوگئی، وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور سبزی فروش عورتوں کی طرف قادر قصاب کو اشارہ کرتی ہوئی بولی:

''ارے چُپ رہ! ایسا نہ ہو کہ تمہاری یہ کنیزیں کوئی اور فسانہ گڑھ لیں۔''

یہ سُن کر سارے بازار والے زور زور سے قہقہے لگانے لگے، مگر سبزی فروش عورتیں پھر خود سے باتیں کرتی ہوئی بڑبڑا رہی تھیں:

''بے غیرت عورت! دیکھ شرم بھی محسوس نہیں کر رہی ہے۔''

☆☆☆
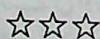
☆......صوفی غلام محمد

(کشمیری سے ترجمہ: زاہد مختار)

عجب ملک اور نوش لب

موومہ:　رُٹن (پکڑو)!!

خورشی:　ژٹن (مارو)!!　(نوک جھونک)

موومہ:　تیرے سر پر بلا منڈلا رہی ہے۔

خورشی:　ہنہ۔ تو کون۔ میں کانگڑی سر پہ دے ماروں گی

یہ سن کر موومہ نرم پڑ گیا اور ہنس کر اُس سے مخاطب ہوا

''کانگڑی میرے سر پہ دے مارنے سے کیا فایدہ۔ ڈھنگ سے دے نا تا کہ میں بھی تھوڑی دیر تاپ لوں۔ مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔''

''میں کیوں دوں۔۔۔میری خود نس نس میں سردی سما گئی ہے''

''ارے واہ۔ تم تو اسے ایک گھنٹے سے تاپے بیٹھی ہو۔ میں بھی سوچوں کہ تمہیں یہ کانگڑی کی آگ اتنی پیاری کیوں لگتی ہے۔ صبح سے شام تک یہ تمہارے ساتھ چپکی رہتی ہے''

''دیکھو، دیکھو کیا بول رہے ہو۔ ابھی تو پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہیں اسے تاپے ہوئے۔۔ ویسے بھی اسے کیا ہوا ہے نہ یہ کانگڑی کی آگ سلگتی ہے اور نا ہی دہکتی ہے''

یہ کہتے ہوئے اُس نے دامن تلے سے کانگڑی باہر نکال کر اُسے اپنی ہتھیلی پہ رکھ کر ہلا دیا۔ اس سے کانگڑی میں جمع راکھ اُڑنے لگی اور کچھ چنگاریاں رقص کرتی ہوئی خورشی کی

آنکھوں میں چبھ گئیں مگر وہ فوراً اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

''پھو۔۔۔۔۔۔پھو۔۔۔۔۔۔۔پھو' وہ اب کانگڑی دہکانے لگی۔لمحوں میں اُس نے انگارے دہکائے اور اس کے ساتھ ہی اُس کا اپنا چہرا بھی لال لال ہوگیا۔

یہ دہکتی ہوئی کانگڑی دیکھ کر جیسے مومہ کے منہ میں پانی بھرا، بالکل اُسی طرح جس طرح ایک بھوکے انسان کے منہ میں کھانا دیکھ کر آتا ہے۔اُس نے ہاتھ بڑھا کر خورشی سے وہ کانگڑی چھیننا چاہی تھی لیکن خورشی نے اُس سے پہلے ہی کانگڑی دامن تلے چھپادی تھی اور اُسے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا جیسے کانگڑی نہ ہو بلکہ کوئی نوزائدہ بچہ ہو جسے وہ سینے سے چمٹائے دودھ پلا رہی ہو۔

''دے نا ذرا سا تاپنے کے لئے۔۔مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے'' مومہ پھر کہنے لگا

''میں کیوں دوں۔''

''غصہ نہ دلا ورنہ میں چھین کے لوں گا۔''

''تو ذرا قریب آ کے تو دکھا۔''

''اچھا۔تو یہ بات ہے'' یہ کہتے ہی اُس نے خورشی کے دامن تلے اپنا ہاتھ ڈال دیا اور اُس سے کانگڑی چھیننا چاہی لیکن خورشی نے کانگڑی کے دو بازو زور سے پکڑے ہوئے تھے۔

''دے نا سیدھے سے ورنہ کانگڑی ٹوٹ جائے گی'' مومہ نے نرم لہجے میں کہا

''ٹوٹنے دو میں ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔''

اب مومہ کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔وہ اُٹھا اور پوری طاقت سے خورشی کے بازو پکڑ لئے۔خورشی نے زور لگانا چاہا مگر مومہ کے قوی بازوؤں کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔اُس نے ہاتھ ڈھیلے کر دیئے اور مومہ اُس کی کانگڑی لے اُڑا۔خورشی کو یوں لگا جیسے مومہ نے اس سے نوزائیدہ بچہ چھین لیا ہو۔اب مومہ ایک کونے میں ہاتھ پاؤں سمیٹے بیٹھا تھا اور کانگڑی اُس کے دامن تلے موجود تھی۔

کانگڑی کو لے کر اکثر ان دونوں میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔کوئی

ایسا دن نہ تھا جب وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے نہ ہوں اور لڑائی کی اکثر وجہ یہی کانگڑی ہوتی تھی۔ صبح نیند سے جاگتے ہوئے اور شام سونے کے وقت یہ دونوں ایک دوسرے کی خوب خبر لیتے تھے۔ مومہ خورشی کے مرحومین کو کوس لیتا اور خورشی مومہ کے آبا کو۔

گھر میں بس مومہ اور خورشی ہی رہتے تھے۔ دونوں جوان تھے مگر جوان ہوتے ہوئے بھی ان کی حالت بوڑھوں سے بدتر تھی۔ دونوں سردی کے معاملے میں بہت کمزور تھے۔ ان کے پاس کھانے کے لئے کچھ ہو یا نہ ہو مگر کانگڑی میں آگ ضرور ہونی چاہئے۔ یہ آئے دن نئی کانگڑی خریدتے رہتے تھے مگر وہ آج کل میں ہی اُن کے باہمی جھگڑے کی وجہ سے ٹوٹ جاتی یا انگاروں کو دہکاتے دہکاتے تمازت کی نذر ہو جاتی۔ آج ''چلۂ کلاں'' کا دوسرا ہفتہ تھا۔ ان دو ہفتوں میں مومہ بازار سے دو کانگڑیاں خرید کے لایا تھا۔ کسی وقت اگر دو میں سے کسی ایک کانگڑی میں آگ نہیں ہوتی تب یہ دونوں آگ والی کانگڑی کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑتے اور کھینچا تانی شروع ہو جاتی۔ اسی کھینچا تانی کی وجہ سے پچھلے دنوں ایک کانگڑی کی شاخیں اُکھڑ گئی تھی اور اُس کی ''کونڈل'' (مٹی کا برتن) ٹوٹ گیا تھا۔ اب یہ کانگڑی ''مٹی والی دیگچی'' (جس میں کوئلے جمع کئے جاتے ہیں) کے پاس ویسے ہی بے کار پڑی رہتی تھی۔ اب ان دونوں میاں بیوی کے پاس ایک ہی کانگڑی تھی۔ جب تک مومہ بازار سے دوسری کانگڑی خرید کے نہ لاتا تب تک اُنہیں اسی ایک کانگڑی پہ گزارا کرنا تھا مگر جب خورشی کانگڑی اپنے دامن میں رکھ لیتی تب آسان نہ تھا کہ مومہ کو اُسے تاپنا نصیب ہوتا۔ اگر یہ کانگڑی مومہ کی دو ٹانگوں تلے آجاتی تو پھر یوں لگتا تھا جیسے کانگڑی ٹانگوں میں ہی پھنس کے رہ گئی ہو اور یہ تب اُس حصار سے باہر آجاتی جب اس کا ایک ایک انگارا راکھ ہو جاتا یا جب خورشی لاتیں مار مار کر مومہ کے ساتھ ساتھ کانگڑی کا بھی بھرکس نکال دیتی۔

مومہ بنیادی طور پہ ایک ہانجی تھا مگر اب یہ کنارے پہ رہتا تھا۔ اس نے کنارے پہ رہنے والوں کی ہی ایک لڑکی سے بیاہ رچایا تھا۔ گرمیوں میں یہ کسی ہاوس بوٹ ہانجی کے پاس مشعلچی کا کام کرتا اور سردیوں میں کسی چوراہے پہ بیٹھ کے چنے یا سنگھاڑے

بیچتا۔ سردیوں میں اگر ایندھن وغیرہ کی فکر نہ رہتی تب یہ سردی کا موسم مومہ کے لئے گرمیوں سے بہتر ثابت ہوتا۔ گرمیوں میں اُسے دوسروں کی نوکری کرنا پڑتی۔ اُسے ہاوس بوٹ ہانجیوں کی گالیاں برداشت کرنا پڑتیں۔ وہ جو کچھ بھی کماتا اسے گھر سے زیادہ چرس کے ٹھکانے پہ خرچ کرتا۔ مومہ کو لوگ مومہ نام سے نہیں بلکہ ''چرسہ گنڈر'' (چرس کی بوٹی) کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ وہ صبح شام بے تحاشا چرس پیتا رہتا تھا اور اسی چرس کے زیر اثر اِدھر اُدھر کی خبریں سنایا کرتا۔

''نوش لب کہاں ہے'' وہ نشے کی حالت میں خورشی کو نوش لب کہتا تھا اور عجب ملک کے انداز میں کوئی گانا گانا شروع کرتا۔ مگر اس گانے کی تفسیر وہ اپنی کھانسی سے کرتا اور جب تک خورشی اُس کے سر پر چھڑی کے دو چار وار نہ جما دیتی تب تک اُس کی کھانسی تھمنے کا نام نہ لیتی۔

مومہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شکارے والے کا بیٹا ہے۔ یہ شکارا والا گگری بل گھاٹ پہ اپنا ایک چھوٹا سا شکارا کنارے کے ساتھ تیار رکھتا اور اگر کوئی سیٹھ یا سیاح کبوتر خانہ جانا چاہتا تو یہ اُسے اُس پار لے جا کر اپنی روزی روٹی کماتا۔ کہتے ہیں کہ ایک رات اُس کی بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہوگئی مگر اُس وقت ڈل طوفانی ہواؤں کی زد میں تھا۔ پانی میں فلک بوس لہریں اُٹھ رہی تھیں اور اُدھر دوسری جانب اُس کی بیوی کی کوکھ میں بھی درد کی لہریں اُٹھ رہی تھی۔ وہ درد سے چلا رہی تھی۔ آس پاس رہنے والے ہانجیوں نے اپنی کشتیاں دور دور تک کنارے کے ساتھ باندھ رکھی تھیں۔ اسی دوران وہ خدا کا نام لے کر اپنا شکارا لئے نکلا۔ دائی دور کنارے رہتی تھی۔ اُس نے عزم کیا تھا کہ وہ کسی بھی حال میں اُس پار جا کر ایک دو روپے دے کر دائی کو اپنے ساتھ لے آئے گا مگر وہ شاید اپنے بیٹے مومہ کی بلی چڑھ گیا۔ کہتے ہیں ایک جانب اُدھر مومہ نے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا اور ادھر دوسری جانب اُس کا باپ اپنی کشتی سمیت ڈل میں غرق ہوگیا۔ مومہ کی ماں بھی اُسے بچپن میں ہی چھوڑ کے مرگئی تھی۔ اُسے خشکی پہ رہنے والے ایک شودر نے گود لیا تھا مگر عمر کے ابتدائی ایام

سے ہی اُسے چرس کی لت لگ گئی کیونکہ جس شخص نے اُسے گود لیا تھا وہ خود چرسی تھا۔ وہ مومہ کے ہاتھوں ہی حقے کا پانی بدلواتا اور بازار سے چرس منگواتا۔

''آخ تھو'' چرس تکیہ (چرسیوں کی آماجگاہ) میں بیٹھ کے وہ ایک چڑیا کے بچے کے برابر باہر سڑک پہ تھوک دیتا۔ گھر میں وہ کبھی کبھار چرس پیتا تھا اور اگر کبھی خورشی اس بات پہ اعتراض کرتی تو وہ اُسے بے تحاشا گالیاں دیتا۔ کہتے ہیں خورشی بھی ایک چرسی کی ہی بیٹی تھی۔ مومہ نے اس کے باپ کی بے انتہا خدمت کی تھی۔ وہ اُس کے حقے کا پانی بھرتا، چرس کا دانا مسل کے دیتا اور چلم دہکاتا اور جوں ہی مومہ دو چار دم بھر کے اپنی ترنگ میں آجاتا تو ''پادشاہو'' نعرہ لگا کے حقہ اپنے آقا کی جانب بڑھا دیتا اور کہتے ہیں اسی دوران یہ آقا مومہ پہ فدا ہو کے بول اُٹھا تھا:۔

''مومہ''

''کیا پادشاہو''

''میں بہت خوش ہوں کہ تم نے میری اتنی خدمت کی، بول تمہیں کیا انعام میں دیا جائے۔''

''پادشاہ کی دعائیں'' مومہ نے جواباً کہا تھا۔

''صرف دعا ہی نہیں بلکہ تم آج سے ہماری اولاد ہو گئے۔''

اُس وقت مومہ مزے میں تھا اور اُسے اپنے آقا کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر دو ہفتوں کے بعد جب مومہ دولہا بن کر گھوڑے پہ سوار ہوا تو اُس پل اُس کی سمجھ میں اپنے آقا کی بات آگئی۔

خورشی مومہ کے لئے ایک قسم کا انعام تھی جو اُسے اپنے آقا نے دیا تھا۔ مومہ اُس کی بہت قدر کیا کرتا تھا۔ وہ اُسے سچ مچ نوش لب کہتا تھا مگر اس سب کے باوجود اُن کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ گرمیوں میں خورشی مومہ کو اس لئے کوستی تھی کہ مومہ مہینے مہینے بھر گھر سے باہر رہتا تھا مگر سرما میں جب وہ دن بھر گھر میں ہی ڈیرا جمائے بیٹھا ہوتا تھا تو ان دونوں کے

درمیان ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ کانگڑی کے لئے بھی بہت ان بن رہتی۔ سارا محلّہ اُن دونوں سے پریشان تھا۔ کوئی دن نہ تھا جب ان کا آپس میں سر پھٹول نہ ہو۔ کوئی اُن کو لڑائی سے باز رکھنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔ اگر مومہ کبھی بازار سے کلیجی پاؤ آدھ پاؤ لے آتا تو جیسے خورشی کے سارے گلے شکوے دور ہو جاتے۔ جس طرح ڈل کی لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پھر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتی ہیں اُسی طرح یہ میاں بیوی بھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر پھر ایک ہو جاتے۔

''خورشی۔ بولو آج کیا پکائیں۔''

''لاو چربی دار گوشت پاؤ بھر۔ شلغم کے ساتھ پکائیں گے۔''

مومہ اُس کی یہ خواہش ہنستے مسکراتے پوری کر دیتا۔ جب تک خورشی چاول اور گوشت پکا لیتی تب تک مومہ تکیہ سے چرس کے ایک دو دم مار کے آجاتا۔ مگر جوں ہی خورشی اُس کے سامنے کھانے کا برتن رکھتی۔ مومہ ''آخ تھو'' کر کے برتن دیوار پہ دے مارتا۔

''مُردار۔۔۔ کھانے میں مرچیں ہی مرچیں ڈال دی ہیں'' اور اس کے بعد مت پوچھو کہ مومہ کتنا آگ بگولہ ہوتا اور کیا کیا بولتا رہتا۔

آج پھر اُن دونوں کے درمیان کانگڑی پہ لے دے ہو رہی تھی۔ مومہ نے بڑی کشمکش کے بعد خورشی سے کانگڑی چھڑا کر اپنے قبضے میں کر لی تھی اور اب مزے میں بیٹھا اندر اندر کانگڑی کی آگ اور راکھ کو ہاتھ سے پھیرتا رہتا۔ مگر خورشی سخت پیچ و تاب میں تھی۔ اُس کی نس نس میں سردی نے اپنا ڈیرا جمایا تھا۔ وہ اُسے کچا چبانا چاہتی تھی مگر چرسی ہو کر بھی مومہ ایک مرد تھا اور اگر وہ مومہ سے زور زبردستی کانگڑی چھیننے کی کوشش کرتی نتیجہ ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ یا مومہ اُس پہ کانگڑی دے مارتا یا خود پہ۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے غصے کو قابو میں کر لیا اور نرم لہجے میں مومہ سے مخاطب ہوئی۔

''تمہیں میری قسم، اب ایک لمحے کے لئے تاپنے دو نا۔''

''اچھا۔ چلو کھانا پروس لو'' مومہ نے جواباً کہا۔

خورشی اُٹھی اور کھانا پروس لیا۔ دونوں کے پیٹ کی آگ تو بُجھ گئی لیکن اُس سے زیادہ اہم کانگڑی کی آگ تھی چنانچہ دونوں لحاف میں گھس گئے۔ مومہ نے کانگڑی اپنے پیروں تلے داب دی اور لحاف کو سر کے اوپر سے اوڑھ لیا، خورشی نے بھی دھیرے دھیرے اپنے پیر پھیلائے۔

آہ۔ کیا زبردست گرمی تھی۔ کانگڑی کی اس گرمی نے اُنہیں ایسے سینکا جیسے مرغی انڈوں پہ بیٹھ کر اُنہیں سینکتی ہے۔ اب مومہ نے بھی ٹانگیں پھیلائی تھیں اور کانگڑی کو اندر ہی اندر سینے تک پہنچا دیا تھا

''اب کب دوسری کانگڑی لاؤ گے'' خورشی بڑے پیار سے مومہ سے مخاطب ہوئی۔

''صبح سویرے اگر تمہارے لئے ایک خوبصورت کانگڑی نہ لائی تو میرا نام نہیں۔''

''اوں۔ دس دن سے تم یہی کہتے آرہے ہو۔ آج لاؤں گا، کل لاؤں گا۔ مگر لاتے نہیں ہو۔''

''نہیں تمہاری قسم۔ اگر کل نہ لایا تو تب کہنا۔''

اس کے بعد یہ دونوں میٹھی باتوں میں کھو گئے۔

''خدا کی قسم، میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں''

''پھر کیوں مجھے مارتے ہو۔''

''ہوتا ہے کبھی غصہ، ورنہ کیا میں تمہارا خیال نہیں رکھتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے مومہ کچھ قریب آگیا۔ کانگڑی پاؤں کی جانب سرکا دی اور خورشی کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور خورشی نے مومہ کے بازو پہ ایک چٹکی لی۔ غصے میں نہیں بلکہ پیار سے۔

''بولو میں کون ہوں؟'' مومہ نے خورشی سے سوال کیا۔

''کون ہو؟..... مرچی بیگ۔''

''نا۔ تمہیں میری قسم۔ بولو نا... شرما گئی... میری قسم بولو نا۔''

''مومہ'' خورشی نے بڑے پیار سے کہا۔

''نہیں بولو۔عجب ملک'' مومہ نے کہا۔

''عجب ملک'' خورشی کے منہ سے نکل پڑا۔

''نوش لب'' مومہ نے خورشی کو مخاطب کیا اور اس کے ساتھ ہی دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔

صبح جب پو پھٹنے لگی۔ مومہ نے سیدھے بازار کا رُخ کیا۔ سڑک یخ بستہ ہو کر لوہا ہوگئی تھی۔ چھتوں سے یخ کی قلمیں لٹک رہی تھیں جیسے انہیں چاندی کے آویزے پہنائے گئے ہوں۔ مومہ کی جیب میں آج معمول سے زیادہ پیسے تھے۔ غلام کرال کے پاس یہ ایک ایک کر کے کانگڑیاں پرکھنے لگا۔ واہ۔ کیا شاندار کانگڑیاں تھیں۔ ایک سے بڑھ ایک رنگ برنگی۔ دُلہن کی طرح سجی سجائی۔ چرار شریف کی کانگڑیوں میں گھنگرو اور چوڑیاں سجائی گئی تھیں۔ ایک کانگڑی درخت کی باریک شاخوں کی بنی کیا خوب تھی۔

''بیٹا۔ اُس کانگڑی کی کیا قیمت ہے۔ وہ جو تصویر کے پاس ٹنگی ہے؟''

''سوا روپیہ'' دکاندار نے جواب دیا۔

''پکا۔''

''پکا سوا روپیہ۔''

مومہ نے جیب سے سوا روپیہ نکالا اور کانگڑی ہاتھ میں لے کر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ خالی تھی بنا آگ کے مگر جیسے اُسے اسی خالی کانگڑی سے گرمی حاصل ہونے لگی ہو۔ اُس نے سوچا خورشی یہ کانگڑی پا کر کتنی خوش ہوگی۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے گھر کی جانب بڑھنے لگا مگر قادر قصائی کی دکان کے پاس پہنچتے ہی اُسے خیال آیا کہ کانگڑی تو اُس نے خرید ہی لی کیوں نہ پاؤ بھر گوشت بھی خریدا جائے۔ اُس نے دس آنے جیب سے نکالے۔ قادر قصائی نے اُسے پاؤ بھر گوشت کاٹ کے دیا۔ ایک ہاتھ میں کانگڑی اور دوسرے ہاتھ میں گوشت لئے وہ دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ

سڑکوں پر یخ جم چکا تھا۔ سڑک جیسے لوہا بن چکی تھی۔

''پادشاہو! یہ کانگڑی کتنے کی لی ہے'' ایک اور چرسی جو سڑک پہ چل رہا تھا مومہ سے پوچھنے لگا۔

''ڈیڑھ روپے کی۔''

مومہ نے چار آنے زیادہ بتائے اور اس کے ساتھ ہی اُس نے تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کئے۔

وہ دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا۔ خورشی اُس کے انتظار میں تھی۔ چرار شریف کی کانگڑی اور پاؤ بھر گوشت دیکھ کر وہ اس حد تک پھولے نہ سمائی کہ اُس نے مومہ کو گلے لگالیا۔

''بولو۔ اب میں نے اپنا وعدہ تو نہیں توڑ دیا'' مومہ نے خورشی سے پوچھا

یہ سنتے ہی خورشی نے اپنا سر جھکالیا۔ مگر مومہ نے اُس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی اور نگاہوں سے نگاہیں ملا کر کہا

''نوش لب''

''عجب ملک'' خورشی کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا اور اس کے ساتھ اُس نے مومہ کی زور سے ایک چٹکی لی۔ مومہ نے زور سے بازو جھٹکنے کی سعی کی لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کی چیخ نکل گئی

''ہائے میں مر گیا''

خورشی مست نیند سے جاگ گئی۔ سارے کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ بستر جل رہا تھا اور جلنے کی بُو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ کانگڑی اُلٹ گئی تھی۔

مومہ محو سوچ تھا کیا یہ سب ایک خواب تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے وہ گانا یاد آگیا۔

مجھے معلوم ہے کہ میں در پہ بیٹھا ہوں، مجھے انتظار ہے۔
لیکن اُس کی نیند مست و مدہوش کر دینے والی کہ وہ بہار ہے۔

☆☆☆

☆......صوفی غلام محمد

(کشمیری سے ترجمہ: زاہد مختار)

کوئلہ چور

غنی، عبداللہ اور محمدو: یہ تینوں ایک ہی جگہ پہ کام کرتے تھے۔ غنی کا کام تھا آٹا گوندھنا، خمیر تیار کرنا، تندور کی آگ کو بھڑکانا۔ پیڑے بنانا، اُن پہ تل اور خشخاش لگانا۔ عبداللہ کا کام تھا تندور میں ایندھن ڈالنا، مٹی کا تیل چھڑکنا، پانی لانا، روٹیوں کا تختہ کھرچ کر صاف کرنا اور لکڑی کاٹنا اور دیگر چیزیں تنور میں لگانا۔

غنی اور عبداللہ کم عمری سے ہی سلطان صوفی کے ہاں کام کرتے تھے۔ اب غنی پچیس سال کا تھا اور عبداللہ بھی لگ بھگ اسی عمر کا تھا مگر نہ غنی کو یہ بات یاد تھی کہ وہ کتنے برسوں سے سلطان کے ہاں کام کر رہا ہے اور نہ ہی عبداللہ کو۔ وہ ساتھ ساتھ ہی آئے تھے اور نانبائی کا کام سیکھنا شروع کیا تھا اور یوں آج تک وہ یہی کام کرتے آرہے تھے۔ ان کا اُستاد کاریگر محمدو نیا نیا ہی سلطان صوفی کے ہاں کام کرنے آیا تھا۔ اُس سے پہلے قادر اُس کی جگہ کام کرتا تھا وہ بھی بچپن سے سلطان صوفی کے ہاں نوکری کرتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ قبل اُس کی موت واقع ہوئی تھی اور اُس کی جگہ صوفی محمد نے لی تھی۔

سلطان صوفی کی دکان بازار میں موزون جگہ پہ تھی۔ اس کی دکان کے سامنے لوگوں کی بڑی چھل پہل رہتی تھی جس کی وجہ سے دیگر نانبائیوں کے مقابلے میں اس کے

ہاں اچھی خریداری ہوتی تھی۔ سارے بازار میں ایک واحد سلطان صوفی ہی تھا۔ جو دن میں روٹیوں (ژوچہ ورو) کے پانچ، چھ بھرے پُرے تختے، ایک تختہ کُلچوں کا اور چار پانچ سو چوئے یعنی ڈیڑھ دو ہزار روٹیاں بیچتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی دکان ایک اور دو آنے کی، باقرخانیوں اور کلچوں سے بھری رہتی تھی۔ وہ دن بھر اندر اپنے کارخانے سے روٹیوں کی بھری بھری ٹوکریاں باہر دکان پہ نکالتا اور اُنہیں چارطرفہ کرسی پہ سجا کے رکھ دیتا اور اُنہیں سجاتے سجاتے ہی گاہک خرید کے لے جاتے تھے۔ اُس کے پاس سینکڑوں گاہک آتے تھے۔ چار چار آنوں کی، روپے دو روپے کی روٹیاں خریدنے والے۔ سلطان صوفی نے اپنی دکان کو دُلہن کی طرح سجا کے رکھا تھا اسی لئے سارے لوگ اُسی پہ واری تھے۔ اُس نے اخروٹ کی لکڑی کا گلے کا ڈبہ بنایا تھا جس میں وہ پیسے رکھتا تھا۔ گلے کے ساتھ ہی ایک کُرسی تھی جس پر فیتے والی چادر بچھائی گئی تھی۔ اس چادر پہ وہ روٹیاں اور کلچے سجا کے رکھا کرتا تھا۔ کرسی کے اوپر والے زینے پہ رنگ دار شیشے کے ٹین رکھے تھے جن میں باقرخوانیاں، قتلم اور کُلچے الگ الگ رکھے ہوئے تھے۔ ان رنگ دار ٹینوں کے اوپر تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک تصویر پہ موٹے حروف سے اللہ لکھا تھا اور دوسرے پہ محمدؐ۔ اس کے علاوہ اُس نے قرآن پاک کی مختلف آیات فریموں میں سجا کے رکھی ہوئی تھیں جو اُس نے اپنی ایمانداری کی گواہی کے طور پر لٹکا کے رکھے تھے۔

دکان کے اندرونی حصے میں ایک کمرا تھا جو کارخانہ تھا جس میں غنی، عبداللہ اور محمد و کام کیا کرتے تھے۔ اس کارخانے میں اتنا دھواں اور اندھیرا رہتا کہ اندر جانا کارِ دارد والا معاملہ تھا۔ دیواریں اور چھت دھویں سے کالی پڑ گئی تھی۔ اس کارخانے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی صرف اندر داخل ہونے کے لئے دکان کے دروازے کا ایک تختہ تھا جہاں سے کارخانے کے اندر روشنی آتی ہے اور جہاں سے دھواں خارج ہوتا تھا۔ کارخانے کے بیچ میں تنور تھا جو صبح سے شام ڈھلنے تک دہکتا رہتا تھا اور دن میں کم از کم چار پانچ من ایندھن ہضم کر جاتا تھا۔ تنور کے ایک طرف انسانی قد کے برابر زمین کھوکھلی کر دی گئی تھی جس میں یہ تینوں کاری گر صبح

سے شام تک تگ و دو کرتے رہتے تھے۔ کولہو کے گرد چکر لگانے کے لئے بیل کے واسطے کھلی جگہ ہوتی ہے مگر ان تینوں کو جو جگہ میسر تھی وہ چار فٹ چوڑی اور پانچ فٹ لمبی تھی۔

صبح سویرے مُرغے کی اذان سے پہلے یہ تینوں کاری گر بیدار ہو کر کارخانے میں آتے تھے اور شام سات بجے تک اسی کارخانے میں مصروف عمل رہتے۔ کارخانے سے فارغ ہونے کے بعد یہ آٹے کے گودام میں داخل ہو کر رات دس بجے تک آٹا چھاننے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد کھانا کھا کر اُسی جگہ سو جاتے تھے۔ دو تین گھنٹے نیند کے بعد وہ پھر سے کمر بستہ ہو کر کارخانے میں داخل ہو جاتے اور باقی رات اور آنے والا دن گزار دیتے۔ پو کب پھٹتی ہے، دھوپ کتنے بجے تک رہتی ہے، دن کب ڈوب جاتا ہے، شام کب دستک دیتی ہے۔ ان تمام باتوں کی اُنہیں کوئی خبر نہ تھی۔ وہ ہزاروں لوگوں کو اپنی ہاتھ کی بنائی ہوئی روٹیاں، ژوچہ ورو، کلچے اور باقر خوانیاں کھلاتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کی بنائی ہوئی باقر خوانیاں تحفے کے طور پر مجموں میں سجا کر لے جائی جاتی تھیں۔ دیواں خانوں میں قہوے کی پیالوں میں ڈالی جاتی تھیں۔ لیکن ان نازک اور کراری باقر خانیوں کے بنانے والے کاری گر دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے دور تھے۔

غنی اور عبداللہ نے جب سے سلطان صوفی کے ہاں کام کرنا شروع کیا تھا تب سے لے کر آج تک اُنہوں نے دو یا تین بار آرام کیا تھا۔ پہلی بار اُس دن جب سلطان صوفی کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ماتم داری کی وجہ سے سلطان صوفی نے اپنا کارخانہ تین دن کے لئے بند رکھا تھا۔ اُس دن غنی اور عبداللہ نے ایک لمبا سانس لے کے کہا تھا ”کاش روز ایسے ہی دن ہوتے“۔

دوسری بار اُنہوں نے آرام تب کیا تھا جب سلطان صوفی نے دوسری شادی کر کے نائید کدل کے محمد نانبائی کی کنواری بیٹی کو اپنے گھر لایا تھا۔ اس دن سلطان صوفی نے پورے ایک دن کے لئے اپنا کارخانہ بند رکھا تھا۔ مگر ایسے مواقع اُنہیں روز روز نہیں ملتے تھے۔ وہ صبح سویرے نیند سے جاگتے ہی خدا سے یہی دعا مانگتے رہتے تھے کہ اُنہیں آرام

کرنے کے لئے ایک دو دن مل جائیں۔ مگر تب تک اُنہیں ایسا کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا جب تک یا سلطان صوفی کی دوسری بیوی کا انتقال ہوتا یا خود صوفی سلطان رحلت نہ کرتا۔

کھانے پینے اور کپڑوں کے علاوہ غنی اور عبداللہ کی تنخواہ ماہوار بارہ روپے تھی۔ اُن کا کھانا پینا صبح شام اور دو دفعہ کی چائے پہ مبنی تھا۔ اُن کو چاول ایک مخصوص مقدار کے حساب سے ملتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے برتنوں میں پاو پاو وزن برابر چاول اور اُس کے اوپر ساگ کے دو چار پتے۔ اُن کا پیٹ ان چاولوں سے نہیں بھرتا تھا البتہ وہ روٹیاں بہت کھاتے تھے سلطان صوفی کے سامنے نہیں بلکہ اس سے چھپ چھپ کے۔ سلطان صوفی اُن کی پوری چوکیداری کیا کرتا تھا کہ کہیں وہ چوری چوری روٹیاں نہ توڑیں مگر وہ جلتے تنور میں گرما گرم روٹیاں گرا دیتے تھے۔ تنور تلے سوراخ سے لوہے کے سیخ سے اُنہیں چوری چوری باہر نکالتے تھے اور یوں سلطان صوفی کے فرشتوں کو اس بات کی بھنک نہیں پڑتی تھی کہ کہاں سے وہ ژوچہ ورو (روٹیاں) غائب کر دیتے تھے۔ اُنہوں نے کارخانے میں ہی تنور کے ساتھ ایک اور سوراخ بنا دیا تھا جس میں وہ روٹیاں اور ژوچہ ورو چھپا کے رکھتے تھے اور شام کو آٹے کے کمرے میں اُنہیں ہضم کر جاتے تھے۔

اُن کا لباس ایک قمیض اور ایک شلوار تھی جو وہ دن رات پہنا کرتے تھے۔ اسی قمیض شلوار سے وہ ہاتھ بھی پونچھتے تھے اور ناک بھی۔ خمیر کے چپکنے سے وہ کپڑے کھال بن چکے تھے۔

دونوں اپنی تنخواہ سلطان صوفی کے پاس ہی جمع رکھتے تھے۔ سال چھ مہینے میں اُن کے ماں باپ یا کوئی اور رشتہ دار گاؤں سے آتا تو وہ اُن کو اپنی تنخواہ کی جمع پونجی سونپ دیتے تھے۔ سلطان صوفی اُن کی تنخواہ کی بھی آدھا تیرا آدھا میرا کر دیتا تھا۔ پانچ کے بدلے ڈھائی سے کام چلا لیتا۔

"دیکھو پچھلے مہینے تم بیمار پڑے تھے نا۔ تمہاری دوائیوں پہ بارہ آنے کا خرچہ آیا اور انجکشن پانچ روپے کا۔"

''اُس دن تم نے بہت نقصان کیا تھا۔ پوری ایک ٹوکری روٹیوں کی جلا ڈالی تھی اس کے میں صرف دس روپے کاٹ رہا ہوں۔''

وہ صرف ہاں میں ہاں کرتے تھے اور وہی سب مان لیتے تھے جو سلطان صوفی کہتا تھا۔ اگر آٹھ مہینے بارہ روپے کے حساب سے بہتر روپے بنتے تھے وہ اُنہیں پچاس روپے ہی دیتا تھا اوپر سے آدھی سے زیادہ رقم اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔

کارخانے میں وہ اس طرح سے کام کرتے تھے جیسے بجلی پہ چلنے والے مشینی پرزے حرکت کرتے ہیں۔ غنی مٹھیاں بھینچ کے بڑے سے لکڑی کے بنے ٹب میں آٹا گوندتا۔ عبداللہ (شُپ) شور پہ سے ہوا دے کر تنور کی آگ بھڑکاتا۔ ووستا محمد وسیخ سے جلتے تنور میں ایندھن ڈھنگ سے رکھتا۔ ادھ جلے ٹکڑے باہر نکالتا۔ تنور کو چاروں طرف سے گرم کرتا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ پہ متحرک۔ جوں ہی اپنی لے میں آتے تو رسول میر یا شمس فقیر کا کوئی گیت ایک ہی آواز میں مل کر گاتے۔ اُس وقت وہ سب کچھ بھول جاتے تھے۔ روٹیوں کا ایک بھرا پُرا تختہ تیار کر کے تنور سے باہر نکالتے اور دوسرا لگانے کی سعی کرتے۔ اس بات کا احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ دن ڈھل گیا ہے۔ سلطان صوفی ٹوکرے بھر بھر کے روٹیاں باہر نکالتا اور روپے کماتا رہتا۔ کون کون سے خریدار آتے تھے وہ تینوں اُس سے بے خبر۔ سلطان صوفی بیچ میں کبھی کارخانے میں دھویں کی وجہ سے آنکھیں ملتا ہوا داخل ہوتا۔ تنور کی جانب ایک نگاہ ڈال کر ماتھے پہ شکن لاتے ہوئے اُن سے مخاطب ہوتا۔

''ارے! یہ کیا روٹیوں کو اتنے تاؤ پہ رکھا ہے۔ ایندھن باہر نکالو۔''

وہ خاموشی سے اُس کا حکم مانتے۔

اگر کوئی گاہک روٹی کے بارے میں کوئی شکایت کرتا تو سلطان صوفی اُن کی بُری درگت کرتا تھا۔ سیخ اُٹھا کر اُن کے انگ انگ کی خبر لیتا تھا۔ وہ اُسے کچھ کہہ بھی نہیں پاتے تھے۔ بے زبان جانوروں کی طرح وہ اُن سے کام لیتا رہتا۔

ایک دن عبداللہ نے خمیر کچھ پتلی رکھی تھی جس کی وجہ سے روٹیاں (ژوچہ ورو)

کچھ ٹیڑھی میڑھی بن گئی تھیں ۔ سلطان صوفی سے سبھی گاہکوں نے شکایت کی تھی ۔ اُسے سخت غصہ آیا تھا اور اس نے جلتے تنور سے ایک دہکتا سیخ نکال کر عبداللہ کے منہ پہ دے مارا تھا۔ چرچر کی آواز کے ساتھ اُس کا چہرا جل گیا تھا اور اُس کا داغ آج بھی اُس کے منہ پہ موجود تھا۔

سلطان صوفی نے اپنے نوکر، اپنی حد میں رکھے تھے۔ اپنے رعب داب سے وہ اُنہیں اُف تک کرنے کی نہ دیتا تھا۔ کوئی معمولی خطا بھی اُن سے سرزد ہوتی تو وہ اُن کی سات پشتوں کو کوستا۔ گالیاں تو اُس کی نوک زبان پہ رہتی تھیں۔

"سسرے۔ ایندھن کیوں زیادہ ڈال دیا ہے تنور میں؟ (ماں کی گالی دے کر) یہ روٹیاں کیوں جل گئی ہیں؟"

وہ اُس کی گالیاں برداشت کرتے تھے کہ اُن کی زندگی میں گالی ایک عام لفظ تھا۔ سلطان صوفی اُنہیں غنی یا عبداللہ کہہ کے بُلاتا یا سسرا کہہ کے، اُن کے لئے یہ ایک جیسی بات تھی۔ اُن کے دلوں سے خودداری اور غیرت کا جذبہ اس طرح ختم ہو گیا تھا جس طرح کی تنور کی تپش سے اُن کے بازوؤں کے بال جل گئے تھے۔ سلطان صوفی کا یہ ماننا تھا کہ کارخانے میں کام کرنے والے سارے نانبائی نوکر بزدل اور بے غیرت ہوتے ہیں مگر اُس کا یہ خیال محمدو نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ محمدو نیا نیا ہی سلطان صوفی کے کارخانے میں داخل ہوا تھا مگر آتے ہی اُس نے کارخانے کے ساکت تالاب میں ایک کنکر پھینک دیا تھا جس سے اُس میں ایک ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ نیا نوکر ہونے کی وجہ سے اور کام زیادہ ہونے کی وجہ سے سلطان صوفی نے محمدو کو نہیں پیٹا تھا اور نہ ہی موٹی موٹی گالیاں دی تھیں بلکہ اُس کے حساب سے کچھ نرم نرم لہجے میں اُس سے مخاطب ہوا تھا

"اے سُسرے۔ اگر کام کرنا ہے تو صحیح ڈھنگ سے کر ورنہ اپنی راہ لے۔"

محمدو کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اُس نے غصے میں سلطان صوفی کو اُلٹا جواب دیا تھا "اُستاد، تمیز سے بات کر لیا۔ اگر دوبارہ سُسرا کہا تو میں برداشت نہیں کروں گا

۔۔۔ہاں۔"

محمد وکی یہ جرأت دیکھ کر غنی اور عبداللہ سکتے میں آ گئے تھے۔ وہ بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ اُنہیں یوں لگا جیسے مادہ بھیڑوں کے ریوڑ میں بھیڑیا گھس آیا ہو۔ محمد و کا خشم ناک چہرا دیکھ کر وہ سہم گئے تھے۔ سلطان صوفی کی زبان بھی گنگ ہو گئی تھی۔ اُس وقت اُس نے مصلحتاً محمد و سے کچھ نہیں کہا مگر اُس کے دل میں یہ بات خنجر کی طرح چبھ رہی تھی۔

محمد و کام تو کرتا تھا مگر اُس کے دل میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی تھی کہ سلطان صوفی غنی اور عبداللہ کو خواہ مخواہ کیوں گالیاں دیتا رہتا ہے۔ جس وقت سلطان صوفی غنی اور عبداللہ کے ساتھ تیز لہجے میں بات کرتا تو محمد و کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ مٹھیاں بھینچ لیتا اور سوچتا رہتا کہ ایک مکہ دے ہی ماروں۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ سلطان صوفی، غنی اور عبداللہ کو نہیں بلکہ اُسے ہی گالیاں دے رہا ہو۔ وہ اُن کی حمایت میں سلطان صوفی کے ساتھ تکرار بھی کیا کرتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ چوری چھپے رات میں یا آٹا چھانتے ہوئے اُنہیں بہت کچھ سمجھاتا اور سکھاتا رہتا تھا۔ اُس کی باتیں اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی تھیں۔ وہ اُن سے کہتا رہتا "گالی برداشت نہیں کرنی چاہیئے" اور وہ ہنستے ہنستے جواب دیتے "دینے دو گالیاں۔ گالی تھوک نہیں کہ چپک جائے"۔

ایک دن سلطان صوفی آٹا لانے کے لئے گاؤں گیا تھا۔ اس دن محمد و نے دل کھول کر غنی اور عبداللہ کے ساتھ باتیں کی تھیں۔ اُس نے اُن سے کہا تھا۔

"تم لوگ کوئلہ چور ہو گئے ہو۔"

"کوئلہ چور" وہ حیرت سے بول پڑے تھے۔

"اور نہیں تو کیا۔ تم لوگوں نے نہیں سنا ہے کہ اگر شیر اپنے جنگل سے نکل کر کسی گاؤں میں گھس جاتا ہے تو وہاں کے دہقان شور مچاتے ہیں۔ کوئلہ چور، کوئلہ چور۔ مارو مارو۔ کوئلہ چور کا نام سنتے ہی شیر کی کپکپی بندھ جاتی ہے۔ اُس پہ رعشہ طاری ہوتا ہے۔ وہ گھبرا کے بھاگ جاتا ہے۔ یہ دہقانوں کی ایک زبردست چال ہوتی ہے۔ اگر وہ چلائیں شیر ہے شیر۔

چھپ جاؤ۔ تب شیر کو اپنی طاقت کا احساس ہو جائے گا اور وہ سارے گاؤں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دے گا۔

وہ اُن سے کہتا رہتا۔ ''تم لوگ بھی کوئلہ چور ہو گئے ہو۔ تمہیں بھی اپنی طاقت کا احساس نہیں۔ اگر تم میں یہ احساس جاگ جائے تو سلطان صوفی کبھی بھی تمہیں گالی دینے کی جرأت نہیں کر پائے گا۔ بارہ روپیوں پہ تمہارا خون نہیں چوسے گا۔ ایک چیتھڑے اور ساگ چاول پہ وہ تمہیں خرید نہیں سکے گا۔''

اُس دن محمدو نے اپنی باتوں سے غنی اور عبداللہ پہ زبردست اثر ڈالا۔ اُنہیں پہلی بار لگا کہ محمدو سچ بول رہا ہے۔ اُس نے اُن کے خفتہ دلوں کو جگایا تھا۔ اُس نے خودداری کی ایک چنگاری بھڑکائی تھی اور یوں اُن دونوں نے محمدو کے ساتھ اس بات قسم کھائی تھی کہ اگر پھر کبھی سلطان صوفی نے اُن میں کسی کو گالی دی تو وہ تینوں مل کر اُس کی خبر لیں گے۔

دوسرے دن وہی ہوا جو اُنہوں نے ایک دن پہلے طے کر رکھا تھا۔ سلطان صوفی نے حسب معمول عبداللہ کو گالی دی۔ عبداللہ جواباً بول اُٹھا:۔

''اُستاد، تمیز سے بات کرو۔''

محمدو نے کہا 'اور کیا، تم ہمیشہ ہمیں گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ تم ہمیں کیا سمجھتے ہو'' غنی نے کہا ''ہم یہ سب اب برداشت نہیں کریں گے۔''

سلطان صوفی ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے سارے کلچے اور باقر خانیاں ایک ساتھ، گر کر سڑک پہ بکھر گئی ہوں۔ اُسے یوں سمجھ آیا کہ تنور کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے دہکتا سیخ اُس کے چہرے پہ آ لگا ہو۔ اُسے زمیں گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔

محمدو دوبارہ بول اُٹھا ''دیکھو اُستاد، غلطی ہم کرتے ہیں۔ ہماری ماں بہن نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ہم زیادہ دیر یہ برداشت نہیں کریں گے''

غنی اور عبداللہ نے بھی محمدو کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملائی اور تینوں اُس سے

مخاطب ہوئے۔

سلطان صوفی نے ذرا سا سانسوں پہ قابو پالیا۔ وہ عقلمند تھا اُس نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ سب محمدو کا کیا کرایا ہے۔ اُس وقت وہ تلخ گھونٹ پی کے رہ گیا۔ اُس نے سوچا کہ اگر میں نے ان سے جواباً کچھ کہا تو یہ تینوں کارخانہ چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یوں اُس کے نقصان کا احتمال تھا۔ لیکن ایک کیل سی اُس کے اندر چُبھ سی گئی تھی۔

دوسرے دن اُس نے غنی اور عبداللہ کو الگ سے اپنے پاس بُلایا۔ گوشت اور چاول کھلائے۔ اُن سے کہا کہ میں تمہاری تنخواہ میں ایک ایک روپے کا اضافہ کردوں گا بس تم لوگ محمدو کی باتوں میں مت آیا کرو۔ اس دن وہ اُن کے ساتھ بڑی نرمی اور حلیمی کے ساتھ پیش آیا۔

''دیکھو غنی، اگر میں تم لوگوں کو ابھی اپنے کارخانے سے نکال دوں گا تو تم لوگ کیا کرو گے۔ بھیک بھی نہیں ملے گی۔ اس نے تمہارے کان بھر دیئے ہیں اور تم بھی اُس کی باتوں میں آگئے۔ یہ تم لوگوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ تم میری اولاد ہو۔ گھر کے بندے مگر یہ سُسرا تمہیں بہکا رہا ہے۔ یہ تمہیں خراب کر کے چھوڑے گا۔ یہ تمہیں گمراہ کردے گا۔ کسی کام کا نہیں رکھ چھوڑے گا۔ صحیح ڈھنگ سے میرے ہاں کام کرتے تھے مگر تم لوگوں کو خوامخواہ کاہلی آگھیرتی ہے۔

سلطان صوفی نے اُنہیں اپنی باتوں سے قابو میں کرلیا۔ اُس نے اُس بھڑکتی چنگاری پہ راکھ ڈال دی جو محمدو نے اُن کے دل میں بھڑکائی تھی دوسرے دن جوں ہی صبح سویرے غنی، عبداللہ اور محمدو کارخانے میں پہنچے، سلطان صوفی باہر سے کارخانے میں داخل ہو اور اور محمدو سے مخاطب ہوگیا۔

''بابا۔ چھٹی کرو۔ مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں۔''

''وجہ؟'' محمدو نے پوچھا۔

''وجہ میرے پاس نہیں ہے۔ تم میرے کارخانے سے نکل جاؤ بس۔ ورنہ میں

جوتے مار کے نکال دوں گا۔تم سمجھتے ہو کہ تم ان بے چاروں کو گمراہ کردو گے۔تم نے خواب میں بھی سلطان صوفی کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ہاں''

محمد و نے عبداللہ اور غنی کی جانب دیکھا مگر اُس نے اُن دونوں کو سر جھکا کر کام کرتے ہوئے پایا جیسے اُن کا اس بات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔وہ ہنستے ہنستے کارخانے سے اوپر آیا اور جاتے جاتے غنی اور عبداللہ پر فقرہ کسا ''کوئلہ چور''۔

سلطان صوفی کی سمجھ میں کوئلہ چور کا مطلب تو سمجھ میں نہیں آیا لیکن غنی اور عبداللہ کے دل کو ایک جھٹکا سا لگ گیا۔اُنہوں نے بھی سوچا کہ وہ بھی محمد و کے پیچھے پیچھے یہ کارخانہ چھوڑ کے چلے جائیں لیکن وہ جرأت نہ کر سکے۔

☆☆☆

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆......صوفی غلام محمد

(کشمیری سے ترجمہ: ولی محمد خوشباش)

علی حجام

ووستہ[1] صدیق کو معلوم تھا کہ ووستہ تیس مار خان ہے۔ وہ تو نہ تین میں تھا اور نہ تیرہ میں۔ وہ خواہ مخواہ لوگوں کے معاملات میں ٹانگ اڑایا کرتا تھا۔

اِس کے برعکس ووستہ علی کا خیال تھا کہ ووستہ صدیق کو اُس کے مشورے سے کام کرنا ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو پھر اُسے کام کرنے کا کوئی حق نہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لینے اور اپنی اپنی اہمیت جتلانے کی غرض سے ایک دوسرے کی عیب جوئی کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر رعب جماتے تھے۔ کبھی کبھار ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے پر بھی آمادہ ہوتے تھے۔

ووستہ صدیق آشپاز تھا اور ووستہ صدیق حجام۔ دونوں پیشے کے اعتبار سے الگ الگ تھے۔ اُن کا آپس میں یوں تو کوئی تعلق نہیں تھا لیکن فی الوقت یہ دونوں سبحان خان کے ہاں کام کرتے تھے جس کے بیٹے کی آج مہندی رات تھی اور آنگن میں زور وشور سے وازوان پکایا جارہا تھا۔ قریب دو خروار گوشت پکایا جارہا تھا۔ ووستہ صدیق کباب بنانے کے لئے گوشت کوٹ رہا تھا اور کچھ معاون آشپاز گوشتابہ تیار کرنے کے لئے ایک خاص پتھر پر

---

[1] ووستہ: کشمیری میں ماہرِ فن کو کہتے ہیں۔

گوشت کوٹ رہے تھے اور کچھ لنگر میں دہکتی آگ کو زیادہ تیز کرنے کے لئے لکڑی ڈال رہے تھے۔ گوشت کوٹنے کی آواز، لکڑی جلنے کی آواز، دیگ دیگچوں کا چھن چھن، بچوں کے کھیلنے کودنے کا شور اور عورتوں کا ونہ وُن ۔۔۔ ایک عجیب ماحول ہے۔ ایک عجیب سی خوشبو ہے۔ دیگ لنگر پر پانی سے لبریز تھے۔ ووستہٕ صدیق اب رِستہ دیگ کے نمک کی مقدار پرکھ رہا تھا۔ وہ ہر دیگ کا مزہ چکھنے لگا اور اِتنے میں اُسے کچھ یاد آیا۔

''اُستاد تیل کہاں رکھا ہے؟'' وہ ووستہٕ علی سے پوچھنے لگا۔ یہ سُن کر ووستہٕ علی آگ بگولا ہوا۔ ووستہٕ صدیق کی طرف ایک نظر ڈالی اور کہا:

ارے تمہیں کوئی خیال ہی نہیں اتنا تیل لے کر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ اب کتنا چاہیئے ۔ یہ کیا پانی ہے۔؟

ارے اُستاد، یہ تیل بالوں میں نہیں لگانا ہے۔ ایک پیسے کا تیل سو آدمیوں کے لئے خرچ کرو گے۔ دو خروار گوشت پکانے ہیں۔ قریب قریب دو ہزار لوگوں کو کھانا کھِلانا ہے۔ اگر شام کو کسی نے شکایت کی تو میں ذمہ دار نہیں۔ ہاں۔''

وہ کیا ہوتا ہے۔ میں ذِمہ دار نہیں ہوں۔ تم نے کیا لوٹ مچا رکھی ہے۔ اتنا تیل تو دو خروار گوشت کے لئے کافی ہے۔ تم کو کچھ آتا ہی نہیں ہے۔

میں تمہارے کے بھروسے کام پر نہیں نکلا ہوں۔ پوری عمر میں نے آشپازی کے کام میں گزاری ہے لیکن اگر ایسے ہی خریداروں سے واسطہ پڑا تب تو خدا ہی حافظ ہے!

ارے میں تو تم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کل تک تو کچھ آتا ہی نہیں تھا اور آج اُستاد بنے ہو۔ خیر یہ تو زمانے کا اُلٹ پھیر ہے ورنہ میں کب تم جیسے لوگوں کو گھاس ڈالتا تھا۔

یہ سُن کر ووستہٕ صدیق کچھ زیادہ ہی ناراض ہوا۔ ووستہٕ علی نے اُسے پتے کی بات بتائی تھی جس کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی آگ بگولہ ہوا۔

ایک پاؤ ایک سیر تیل اور ہونا چاہیئے ۔ اگر دو گے تو اچھی بات ورنہ اِس سارے واز وان کو آگ کے حوالے کر دو۔

یہ تو ووستہٕ علی کے لئے چیلنج تھا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہ تو دے سکتا تھا اور نہ ہی انکار کر سکتا تھا۔ اگر دے دیتا تو یہ اُس کے لئے باعثِ شرمندگی اور اگر نہ دیتا اُس کا مطلب یہ تھا کہ ووستہٕ علی سارے وازوان کو وہیں پر چھوڑ کر چلا جاتا۔ ووستہٕ علی ابھی اِسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کیا کِیا جائے اِدھر سے سبحان خان کہنے لگا:۔

اچھا چھوڑو، جانے دو۔ دے دو ایک اور سیر تیل۔ جہاں سو وہاں سوا سو۔ ووستہٕ علی غصہ بھرے انداز میں ایک اور سیر تیل لانے کے لئے اوپر چلا گیا۔ ادھر سے ووستہٕ صدیق من مانی پر خوش تھا۔ مگر ادھر سے ووستہٕ علی کچھ یونہی اُداس اور اُس کی اُداسی اُس کے چہرے سے جھلک رہی تھی کیونکہ ووستہٕ صدیق اس کے ساتھ سبھی کے سامنے ذِلت آمیز طریقے سے پیش آیا تھا۔ لیکن ووستہٕ علی بھی پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ وہ اندر ہی اندر غصے کی آگ میں جل رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے اور کس بہانے سے میں اِس کی درگت بنالوں۔ آخر کار اس کے دماغ میں کچھ خیال آیا۔

ووستہٕ علی، صاحبِ دعوت اور اُس کی بیگم کا کوئی رشتہ دار تھا نہیں لیکن اُس کے باوجود سبحان خان کے ہاں ہونے والی شادی کی تقریب کو انجام تک پہنچانے کی ساری ذمہ داری اُسی کے ذِمہ تھے۔ آشپاز کی ضرورتوں کو پورا کرنے، دُلہے کو سجانے سنوارنے، کمروں کو سجانے، مہمانوں کا استقبال کرنے اور روٹھوں کو منانے، نفع نقصان کا تخمینہ لگانے تک کی ذمہ داری اُسی کے سر تھی۔ یوں تو سبحان خان خود صاحبِ دعوت تھا لیکن اُس کے باوجود اُسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ کونسی چیز کہاں پہ ہے۔ آشپاز کی کیا کیا ضرورتیں ہیں، دُلہے کی ضرورتیں کیا کیا ہیں۔ سونا چاندی کِتنا ہونا چاہئے۔ مہمانوں کا خاطر تواضع کِس طرح کی جانی چاہیئے۔ ترامیاں کتنی ہونی چاہیں۔ دستر خوان کتنے موجود ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اِن سبھی چیزوں کی ذمہ داری علی حجام کو سونپی گئی تھی۔ اُس نے یہ سبھی چیزیں ایک ماہ قبل جمع کر رکھی تھیں۔ وہ خود زینہ کدل گیا تھا اور وہاں سے لہسن لایا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ محلے میں کس گھر والے کے پاس کتنی ترامیاں ہیں، کتنے دستر خوان اور طشت وغیرہ ہیں۔ اُسے یہ بھی

معلوم تھا کہ ایک خروار چاول پکانے کے لئے کتنے مقدار میں گوشت ہونا چاہئے۔ فی ترامی کے لئے کتنا گوشت لازمی ہے۔ قسم قسم کے پکوانوں کی کتنی ترامیاں ہونی چاہیئے۔ عورتوں کو کِس وقت شادی کے روایتی گیت گانے ہیں یعنی ونہ وُن لازمی ہے۔ ووستہ علی نے دُلہے کی بارات کے ساتھ جانے والے باراتیوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ سبحان خان کے کتنے رشتے دار ہیں۔ کون کون نزدیکی رشتہ دار ہے اور کون دور کا۔ کِس کو دعوت پر بُلانا ضروری ہے اور کس کس کو نہیں۔ کِس کِس کے ساتھ لین دین ہے۔ غرض ووستہ علی سبحان خان کا ایک مشیر بھی تھا اور راز دار بھی۔ وہ جو بھی مشورہ سبحان خان کو دیتا تھا اُسے وہ ضرور مانتا تھا۔

ووستہ رزاق کو دعوت پر بُلانے کے لئے کوئی گیا تھا یا نہیں۔ سبحان خان ووستہ علی سے دریافت کر رہا تھا۔

خان صاحب! آپ بنا کِسی فکر کے رہیں۔ اللہ کی مہربانی سے میں کِسی کو نہیں بھولوں گا۔

''نا'' ایسا نہ ہو کہ کل مجھے کسی کی شکایت سُننی پڑے۔ ارے جب کوئی شکایت ہوگی تو میں ذمہ دار ہوں۔

ووستہ علی نے محلے میں سبھی نزدیک کے ہمسایوں کو خدا کی قسم دے کر دعوت پر بُلایا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود ابھی کچھ گھرانے ایسے باقی تھے جنہیں دعوت پر نہیں بُلایا گیا تھا۔ اب تو دو بجنے لگے تھے۔ تمام خواتین وحضرات نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ ووستہ علی کو ابھی بہت سے کام کرنے سے رہ گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پہلے کِس کام کو ترجیح ملنی چاہئے۔ گیس لیمپوں کا انتظام کروں یا براتیوں کو بلاوا بھیجوں، گیس لیمپ تو بعد میں بھی لائے جاسکتے ہیں اُن کی ابھی جلدی نہیں۔ اس نے سوچا اور محلے کی جانب سے چل پڑا۔

ارے حسن بٹ۔ حسن بٹ۔ گھر پر ہی ہو؟ اُس نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

آہا۔ ووستہ آیا ہے۔ آیئے نا۔ آیئے اندر۔

نہیں نہیں۔ بیٹھنے کے لئے کہاں فرصت ہے۔ شام کو سبحان خان کے ہاں دو افراد کو دعوت ہے۔ ذرا جلدی آنا۔ اِنشا اللہ۔

اپنی گھر والی کو بھی ساتھ لانا۔ ہاں بھول نہ جانا۔

نانا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کا کہنا اور ہم نا مانیں۔ دوستہِ علی گھر گھر جا کر لوگوں کو دعوت پر بُلانے کیلئے جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ میری کتنی عزت کرتے ہیں۔ آخر کریں بھی کیوں نا۔ میں جو سال بھر خدمت کرتا رہتا ہوں۔ غم ہو یا مسرّت میں تو ہر حال میں پیش پیش رہتا ہوں۔ وہ کس گھر کی بیٹی یا بیٹا ہو گا جس کی شادی پر میں نہ گیا ہوں گا۔ وہ کون سا وازہ وان ہو گا جس کا انتظام میں نے نا کیا ہو۔ وہ کون سا بچہ ہو گا جس کا ختنہ میں نے نہ کی ہو۔ کِسی کے دانت میں درد ہو تو علاج میں کرتا ہوں۔ کوئی ذرا سا بھی بیمار ہو تو میں حاضِر خدمت ہوتا ہوں۔ زخموں کی مرہم پٹی تک میں ہی کرتا ہوں۔ سال بھر میں ہی ہر چھوٹے بڑے کی حجامت کرتا ہوں۔ لوگ اگر میری عزت کرتے ہیں تو یونہی نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ خدمت عظمت ہوتی ہے۔ میں تو ہر کسی کی خدمت کرتا ہوں تو وہ بھی میری عزت کرتے ہیں۔ سبحان خان کو ذرا سی بات بھی معلوم نہیں ہوتی۔ میں ہی گھر کا چھوٹا بڑا کام انجام دیتا ہوں۔ صدیق وازہ خود کو اُستاد کہتا ہے۔ کہاں کا اُستاد ہے وہ۔ سال بھر تو خدمت کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہوتی ہے اور آج شادی کے روز وہ ٹھیکیدار بن گیا۔ آخر اب اگر میں نے اُسے ایک سیر تیل زیادہ نہ بھی دے دیا تو کیا خطا کی۔ میں نے تو سبحان خان کے نفع کے بارے میں ہی سوچا تھا۔ اُس نے مہدہ وازہ کو کیوں نہیں ٹوکا۔ میری طرف داری کیوں نہیں کی۔ آخر کار یہ لوگ طوطا چشم ہوتے ہیں۔ عُمر بھر خدمت کرنے کی ذمہ داری مجھے رہی لیکن ایک بار آشپاز کیا گھر آیا سبھی لوگ اُسی کی عزت افزائی کرنے لگتے ہیں۔ یہ آشپاز مدعو لوگوں پر بھی رُعب جماتے ہیں اور صاحب دعوت پر بھی۔ چلو مان لیا صاحب دعوت پر رعب جما لیا لیکن میری کیا خطا ہے۔۔۔۔ اب کتنے گھر باقی رہ گئے اور۔۔۔ قادِر سراج کے ہاں بھی جانا ہے اور خالق میر کے ہاں بھی۔

ووستہ علی گھر گھر جاتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کررہا تھا۔۔۔ وہ اب سبھی محلے والوں کو خدا کا واسطہ دے کر واپس آ گیا ہے۔ آنگن میں لنگر زور وشور سے چل رہا تھا۔ عورتیں دھوم دھام سے ونہ وُن گا رہی تھیں۔ بچے اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر دوڑ رہے تھے۔ دیگوں میں سے جو خوشبو نکل رہی تھی اُس سے دِماغ کو تازگی اور فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ اِسی روز پاس کے اور دور کے سبھی مہمان آ جاتے ہیں۔ ووستہ علی دروازے پر کھڑا تھا اور سبھی آ رہے مہمانوں کو مکان کی اوپری منزل پر جانے کا اشارہ کررہا تھا۔ خواتین کو الگ کمرے میں بیٹھنے کا اشارہ کررہا تھا۔ بالآخر مرد حضرات کے لئے دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ وہ دعوت پر آئے سبھی مہمانوں کی گنتی میں مصروف تھا۔

ووستہ کھانا پروسو!

ووستہ صدیق کھانا پروسنے لگتا ہے اور سبھی مہمان کھانا کھانے لگ جاتے ہیں۔ ووستہ علی اب بھی اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی مہمان دعوت پر آنے سے رہ تو نہیں گیا ہے۔ اِس طرح مہندی رات اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ سبھی مہمان کھانا کھانے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔ بچوں کا شور بھی قدرے کم ہو جاتا ہے اور خواتین بھی کسی حد تک خاموش ہو جاتی ہیں۔ ووستہ علی ایک کونے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ بے قراری کے عالم میں کل کے بارے میں سوچنے لگتا ہے کہ کیا ہونا چاہیئے اور کیا نہیں۔ آخر کل دُلہے کو عروسی لباس میں سجانا ہے۔ اُسے گھوڑے پر سُسرال پہنچانا ہے۔ اِسی فِکر میں ووستہ علی کی آنکھ لگ جاتی ہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ووستہ علی دُلہے کے بالوں کو تراشنے اور سنوارنے لگتا ہے۔ عورتیں ونہ وُن گانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اِس کے بعد ووستہ علی دُلہے کو غسل کرواتا ہے اور عروسی جوڑا پہنا کے مسند پر بٹھاتا ہے۔ ووستہ علی دُلہے کی دائیں طرف بیٹھتا ہے اُس نے اپنے سامنے ایک کٹورا رکھا ہوتا ہے۔ خواتین ایک ایک کر کے دُلہے کو اسپند کانگڑی سامنے رکھ کر شیرینی اوپر ڈالتے ہیں اور یوں اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتی

ہیں۔ کبھی مہمان دُلہے کو دست بوسے کیلئے آتے ہیں۔ اُسے پیسے دیتے ہیں۔ ووستہٕ علی کی کٹوری میں بھی آٹھ آنے روپیہ دو روپے ڈال دیتے ہیں۔ وہ بیچ بیچ میں غصہ ہو جاتا ہے اور بچوں پر رعب جماتا ہے اور اُنہیں بھگا دیتا ہے۔ دُلہے کے دستار کو سلیقے سے رکھنے کے بعد شال اوڑھتا ہے۔ کبھی اُس کو کان میں بھی کچھ کہہ دیتا تھا۔ براتی ایک ایک کر کے آرہے تھے اور دُولہے کے اِرد گرد بیٹھ جاتے تھے۔ عورتیں وَنہ وُن گانے میں مصروف تھیں وہ کبھی دُلہے کے ناک و نقشے اور کبھی کپڑوں اور دستار کے حوالے سے شعروں میں تعریفوں کے پُل باندھتی تھیں اور کبھی ووستہٕ علی کی تعریف میں بھی دو چار شعر ونہ وُن کے روپ میں گا رہی تھیں۔ اِس وجہ سے ووستہٕ علی پھولے نہیں سما رہا تھا اور خوشی کے مارے اندر ہی اندر جھوم رہا تھا۔ اُسے اپنی اہمیت اُتنی ہی نظر آرہی تھی جتنی کہ دُلہے کی تھی۔ اِس دوران اُسے صدیق آشپاز کی بھی یاد آتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ صدیق آشپاز کو اُس کے ساتھ جھگڑنے کا کوئی حق نہیں۔ آخر وہ ہے کون؟ آج شام تک وہ یہاں اس گھر میں ہے اور کل اُسے اپنا بوری بستر باندھ کے یہاں سے چلے جانا ہے۔ میں تو سال بھر خدمت کرتا رہتا ہوں۔ ہر گھر کا راز دار ہوں اور ہر گھر کا سیاہ و سفید جانتا ہوں اور صدیق آشپاز مجھ پر رعب جمائے گا۔۔۔ یہی سوچ کر وہ نیچے لنگر کے نزدیک آجاتا ہے۔ ووستہٕ صدیق گوشت کوٹ رہا ہوتا ہے۔

"تم نے کتنے آدمیوں کو لایا ہے"۔ ووستہٕ علی صدیق آشپاز سے پوچھتا ہے۔

"پانچ"۔ صدیق آشپاز جواب میں کہتا ہے۔

پانچ۔ ووستہٕ علی چونک سا جاتا ہے۔ پانچ کس لئے لائے ہیں۔ تم کو تو ہم نے دو لانے کے لئے کہا تھا۔ کل تو دو خروار گوشت پکانے تھے اور مزدور کُل پانچ تھے۔ آج صرف ساٹھ کلو گوشت پکانے ہیں اور کیا آج بھی برابر پانچ مزدور ہیں۔ وجہ!۔

آخر آج کہاں جاتے یہ۔ ووستہٕ صدیق نے رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے معلوم نہیں۔ آج ہم پانچ مزدور کی مزدوری نہیں دیتے۔ اِتنے سارے مزدور آج ہیں، کس کے لئے؟۔

ارے تو کون ہوتا ہے؟ یہ معاملہ میرے اور سبحان خان کے درمیان ہے۔تو مجھے بات بات پر رعب جمانے کیوں آتا ہے؟

ہاں۔سبحان خان کو تو تم نے سیدھا سادھا سمجھا ہے نا۔لیکن یاد رکھو سبحان خان کو اِس معاملے کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ یہ کہہ کر علی حجام اُوپر دُولہے کے پاس چلا گیا۔ اُس نے اپنی طرف سے صدیق آشپاز کی مٹی پلید کی تھی۔مگر صدیق آشپاز بھی اتنا کچھا نہیں تھا۔اُس نے تو علی حجام کو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ایسی چوٹ ماری کہ جس سے وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہوا۔نہ تو تین میں ہے اور نہ تیرہ میں۔خواہ مخواہ لوگوں کے معاملے میں ٹانگ اُڑاتا ہے۔

صدیق آشپاز کی یہ بات سبھی براتیوں نے سن لی تھی۔ وہ سبھی ہنس رہے تھے۔ ووستہ علی دُلہے کے پاس بیٹھا تھا۔لیکن اندر ہی اندر اُسے یہ بات کھٹک رہی تھی۔

سبھی باراتی اب جمع ہو چکے تھے۔دُلہے کو دس بجے رات سُسرال پہنچنا تھا۔گھوڑا بھی آ چکا تھا اور سائیس اُسے اپنے ہاتھ سے سہلا رہا تھا۔ بچے انتظار میں تھے کہ دُلہا کب نکلے گا لیکن ابھی بھی چند مستورات ایسی رہ گئی تھیں جنہیں کھانا کھلانا باقی رہ گیا تھا۔

کھانا پروسو۔ووستہ علی نے حکم جھاڑ دیا۔دُلہے کو جلدی سُسرال پہنچنا ہے۔ پہلے اُسے آستانہ دستگیر صاحب پر جانا ہے اور بعد میں مخدوم صاحب کی زیارت پر حاضری دینی ہے۔دُلہے کو سُسرال کی طرف روانہ ہونے سے پہلے صاحبِ دعوت کو دس چیزیں سنبھالنی پڑتی ہیں۔ترامیاں، طشت، دسترخواں واپس اپنی اپنی جگہوں پر رکھنی ہوتی ہیں۔گھر آئے مہمانوں کے لئے بسترے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔دُلہا تب سُسرال کی طرف جانے لگتا ہے جب لنگر بند ہو جاتا ہے۔سبھی باتوں کی طرف دھیان رکھنا پڑتا ہے تا کہ کسی کی ترامی یا کوئی اور چیز گم نہ ہو جائے۔کوئی بھی ناراض نہیں ہونا چاہیے لیکن علی حجام اِن سبھی باتوں کا خاص خیال رکھے ہوئے ہے۔اُس نے ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ واپس رکھی ہوئی ہیں۔ اب دُلہا نکلنے کو تیار ہے۔ مستورات نے شیرینی اپنی اپنی جگہ سنبھال کر رکھی ہے۔وہ بے

صبری سے دُلہے کے سُسرال روانہ ہونے کا انتظار کر رہی ہیں تا کہ وہ اپنی والہانہ محبت کا اظہار ونہ وُن کے گیتوں سے کریں۔

۔۔۔۔۔ باراتی بھی اب دُلہے کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہیں۔ گھوڑے کو سجایا گیا ہے اور مشعلوں کی چمک چاروں طرف سے دِکھائی دے رہی ہے۔ بچے گھوڑے کے آس پاس کھڑے ہیں اور کبھی کبھی اس کو چھیڑتے بھی ہیں۔۔۔۔ اِسی دوران دور سے کچھ شور سنائی دیتا ہے۔ ووستہ علی اور ووستہ صدیق نے آپس میں جھگڑا شروع کیا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ دیگ چھوڑ دو۔۔۔ ووستہ صدیق کہتا ہے میں نہیں چھوڑوں گا۔

دونوں دیگ کو مختلف طرفوں سے کھینچتے ہیں۔ آپس میں دشنام طرازی پر اُتر آتے ہیں۔ زبان سنبھال کر بات کرو، ووستہ علی، ووستہ صدیق سے کہتا ہے۔

ارے تو کون ہے۔ دو پیسے کا نائی۔ مجھے رعب دِکھاتا ہے۔ نائی ہی تو ہوں۔ تمہاری طرح چور نہیں۔

اب تو اِس جگہ سبھی باراتی جمع ہوئے۔ سبحان خان بھی آپہنچا۔ کیا بات ہے؟

یہ دیکھو نا اِس نے رستہ دیگ چھپا کر رکھی ہے۔

ارے بڑا بے ایمان ہے تو۔ یہ سبحان خان نے ووستہ صدیق سے کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو ایسا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید ووستہ علی یونہی جھگڑتا ہے۔

صدیق آشپاز نے اب رستہ دیگ کی پکڑ کچھ ڈھیلی کردی تھی۔ وہ اب علی کے ہاتھ میں تھی۔ ووستہ علی اب اِس طرح صدیق آشپاز اور باقی براتیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کہ وہی دُلہا تھا اور جیسے اُسی کو دُلہن لانے کے لئے سُسرال جانا تھا۔

☆☆☆
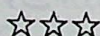
☆......صوفی غلام محمد

(کشمیری سے ترجمہ: روف راحت)

پر کاش کول

آج عمہ وانی اور پر کاش کول کے بیچ اچانک ان بن ہوگئی۔ بات دراصل معمولی تھی۔ کہاوت ہے کہ بات کا بتنگڑ بنتا ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔ پر کاش کول نے تو ایسے ہی کہا تھا:

''انگریز جرمنی کو پچھاڑ دیں گے''۔

مگر عمہ وانی کو انگریز ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تھے۔ معلوم نہیں اُس کو انگریزوں کے ساتھ کیا بیر تھا۔ اسی لئے انگریزوں کی تعریف کرنا برداشت نہیں کیا۔

''پر کاش کول! ہوش کے ناخن لو۔ یہ جرمنی ان انگریزوں کو سبق سکھائیں گے۔''

عمہ وانی کو معلوم نہ تھا کہ جرمنی کوئی ملک ہے بلکہ وہ جانتا تھا کہ جرمن کوئی بہادر شخص ہے۔ جیسے ہٹلر۔ عمہ وانی کا خیال تھا کہ جرمن اور ہٹلر آپس میں دوست ہیں اور ان دونوں نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ تب تک دم نہیں لیں گے جب تک نہ انگریزوں کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ عمہ وانی جرمنی اور ہٹلر کی تعریف کیوں کرتا تھا یہ اُسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔ شاید اُس کو ان دونوں لفظوں میں یکساں قوّت اور دبدبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ''جرمن'' اس انداز سے کہتا تھا جیسے یہ لفظ اُس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہو۔ لفظ ''ہٹلر'' کہتے وقت وہ ''ر'' پر اتنا زیادہ زور ڈالتا تھا جیسے اُس کی زبان تالو کے ساتھ چپک گئی ہو۔

پرکاش کول کہتا تھا:

''اے عمہ! جرمن کوئی انسان نہیں، یہ ایک ملک ہے۔''

''پرکاش کول! مجھے سب پتہ ہے۔ اگر چہ میں نے تمہاری طرح پانچ حروف نہیں پڑھے ہیں لیکن خدا کی مدد سے مجھے یہ خبر ہے کہ جرمن کتنا بہادر ہے۔''

پرکاش نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ عمہ وانی کے ساتھ اس معاملے میں زیادہ بحث کرے، کیونکہ وہ بات بات پر بپھر جاتا تھا۔ جو وہ کہے وہ پتھر کی لکیر ہے۔

عمہ وانی ایک معمولی بنیا تھا۔ اُس کی دکان میں کُل دو تین ٹوکریاں، دو چار مٹکے اور پانچ آٹھ مرتبان تھے، جن میں تیل، چائے، نمک، مرچی رکھی ہوئی تھی۔ دکان کی باہری چھت پر کچھ جوتے اور دو چار حقّے کی نلیاں آویزاں تھیں۔ دکان میں موجود کُل سامان کی قیمت دس بارہ روپے تھی۔ عمہ وانی کی یہ دکان کسی بازار میں نہیں تھی بلکہ ایک گلی میں تھی۔ گلی میں لوگوں کا رش رہتا تھا۔ ہر شام عمہ وانی کی دکان پر ایک بڑی مجلس آراستہ ہوتی تھی۔ محلے کے پانچ آٹھ لوگ اپنے دن بھر کا کام کاج نپٹا کر شام کو عمہ وانی کی دکان پر حاضر ہو کر دیر تک گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ عمر رسیدہ تھے جن کی عمر پچاس سے تجاوز کر گئی تھی۔ عمہ وانی خود اُدھیڑ عمر تھا لیکن اُس کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔ لسہ خان رفوگر تھا لیکن شام کو وہ ضرور عمہ وانی کے پاس حاضر ہوتا تھا۔ قادر بٹ ریشم خانے میں تارکشی کرتا تھا مگر کوئی دن ایسا نہ جب وہ عمہ وانی کے پاس حاضر نہ ہوتا۔ پرکاش کول محکمہ مال میں کلرک تھا۔ وہ اب ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ وہ صبح دس بجے کام پر نکلتا اور شام چار بجے اپنے گھر واپس لوٹ آتا تھا۔ دفتر میں دن بھر جو سنتا، جو خبر اُس کے کانوں تک پہنچتی وہ سب کچھ شام کو اپنی برادری کے سامنے لاکر رکھ دیتا۔ یہ دکان کیا تھی ایک ریڈیو اسٹیشن، جہاں خبریں پہنچتی تھیں اور جہاں سے خبریں روانہ ہوتیں تھیں۔ اس دکان کا سرخیل پرکاش کول تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ پرکاش کول ہی اس برادری کی جان تھا۔ اگر کسی دن پرکاش کول کی حاضری ممکن نہیں ہوتی تو اُس دن عمہ وانی کی دکان بے رونق معلوم ہوتی۔

پرکاش کول کو محکمۂ مال میں بیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ان بیس سال میں اُس کی بہت لوگوں کے ساتھ بڑی جان پہچان بنائی تھی۔ وہ سارا کشمیر گھوما تھا۔ ملازمت کے ابتدائی تین سال گلگت میں گزارے تھے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے مظفر آباد، راجوری، میرپور، بھدرواہ، کشتواڑ اور باقی پہاڑی علاقوں میں اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔ پرکاش کول نے کشمیر کے مختلف علاقوں کی بولیاں سیکھ لی تھیں۔ اگر کسی دن کوئی لداخی عمہ وانی کی دکان سے گزرتا، پرکاش کول اُس کی پیشانی کو دیکھتا اور کہتا:

لداخس لاینگ کار جیوقسہلمہ

وہ لداخی ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ کہتا کہ اُس کے علاقے کا یہ کون سا آدمی یہاں آیا ہے۔ لیکن ایک دم سے اُس کی غلط فہمی دور ہو جاتی تھی جب وہ ایک کشمیری پنڈت کو ہنستے ہوئے اپنی بولی بولتے دیکھتا:

لداخس لاینگ کار جیوقسہلمہ

(لداخ میں تم کہاں رہتے ہو؟)

اس کے بعد دیر تک وہ آپس میں لداخی میں بات کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ پرکاش کول خود ایک لداخی ہے۔

پرکاش کول دفتر جانے کے لئے ہمیشہ سفید تنگ پائجامہ، وولن کوٹ اور سر پر سفید صافہ پہنتا تھا۔ وہ صافہ انوکھے طریقے سے باندھتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پنیر کی کوئی تھالی اُس کے سر پر ہو۔ اُس نے معمولی تعلیم حاصل کی تھی۔ شاید مڈل پاس تھا۔ لیکن دفتری کاموں میں وہ بے حد ماہر تھا۔ بڑے بڑے ہیڈ کلرک اور سپرانٹینڈنٹ اُس سے خاص معاملات میں مشورہ لیتے تھے۔ کسی وقت وہ ڈرافٹ بھی خود تحریر کرتا تھا۔ اُردو، فارسی اور ہندی کے علاوہ وہ کچھ کچھ انگریزی بھی جانتا تھا۔ سنسکرت کے شلوک اُسے زبانی یاد تھے۔ حضرت سعدیؒ کی ''گلستان بوستان'' کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ جب وہ کسی بچے کو نصیحت کرتا تھا تو وہ فارسی شعر کا حوالہ بھی ضرور دیتا تھا۔

ایک دن عمہ وانی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تھوڑا مانگنے پر بہت ڈانٹا۔ جس سے بچے کی چیخ نکل گئی۔ عمہ وانی کو اب بیٹے پر ترس آیا۔ اُس نے مرتبان میں سے ایک پیسہ نکال کر اُسے دے دیا۔ لیکن بیٹے نے یہ پیسہ اُس کے منہ پر دے مارا اور بھاگ گیا۔ پرکاش کول یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اُسی وقت عمہ وانی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ دانا آدمی کا قول ہے کہ:

اگر حنظل خوری از دست خوش خوے
بہ از شیرینئی از دستِ ترش روے

پرکاش کول نے جب اس کے معنی عمہ وانی پر واضح کر دیئے تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

پرکاش کول دفتر سے لوٹ کر جب عمہ وانی کی دکان پر ٹیک لگا کر بیٹھتا تھا تو وہ معمولی فقیر کی طرح نظر آتا تھا۔ کیونکہ وہ صوف کا ایک لمبا اور میلا پھیرن پہنتا تھا۔ سر پر پرانے زمانے کا کنٹوپ پہنتا تھا جو شاید اُس کے دادا کے زمانے کا تھا۔ دفتر جاتے وقت وہ جوتی پہنتا تھا اور دفتر سے لوٹ کر ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے لئے گھاس کی چپل پہنتا تھا۔ اُس کے چپل کی آہٹ سنتے ہی ساری برادری عمہ وانی کی دکان کا رخ کرتی تھی۔

''اے پرکاش جُو! کیا یہ سچ ہے کہ مہاراج صاحب کو ولایت تشریف لے جانا ہے؟'

''جی ہاں' بادشاہ سلامت کے ساتھ کسی معاملے پر صلاح مشورہ کرنا ہے''

''کون سا معاملہ''

''وہ کہاں پتہ ہے۔ رموزِ مملکت خسرواں مے دانند!''

پرکاش کول کی فارسی مثال سُن کر سب خاموش ہو گئے۔ اگرچہ وہ اس کے معنی سمجھ نہیں سکے لیکن پھر بھی اُنہوں نے اس لئے خاموشی اختیار کی کہ شاید یہ کوئی دانائی کی بات ہو۔

پرکاش کول پورا کشمیر گھوما تھا۔ اُس نے طویل اور پیچیدہ سفر طے کئے تھے۔ جب اُس کا تبادلہ لداخ ہوا تھا تب وہ بہ مشکل تیس سال کا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی وہ اپنے

اصولوں کا بہت پابند تھا۔ سفر میں خود ساگ اور چاول پکاتا، اپنے کپڑے اور برتن دھوتا، کپڑے ہمیشہ صاف پاک رکھتا۔ دورانِ سفر وہ بھوکا رہنا پسند کرتا تھا لیکن کسی اجنبی کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کبھی نہیں کھاتا تھا۔ اگر اُسے پانی بھی پینا ہوتا وہ تو اسی طرح پیتا جیسے اُس کے بزرگ پیتے تھے۔ وہ خود آب دانی کے پیندے کو پکڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے اُس کی دھار حلق پر انڈیلتا تھا اس انداز سے پانی پینا ایک فن ہے۔ مگر پرکاش کول اس انداز سے ساری آب دانی گھٹ گھٹ پیتا تھا۔

پرکاش کول آج اُدھیڑ عمر میں داخل ہوگیا ہے۔ وہ جوانی کی سرحد پھلانگ کر بڑھاپے میں داخل ہو چکا ہے جہاں انسان کے اعصاب پر کمزوری سوار ہوتی ہے اور اعضاء ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں مگر پرکاش کول آج بھی صبح صادق سے پہلے ہی ننگے پاؤں پربت پر چڑھتا۔ وہاں دیوی کے آگے پوجا پاٹ بھی کرتا۔

پرکاش کول نے اپنی زندگی میں بہت انقلاب دیکھے ہیں۔ بہت مصائب جھیلے ہیں۔ خوشحالی بھی دیکھی ہے اور قحط سالی بھی۔ وہ اُس دور کی باتیں کرتا جب مشکہ بدجی دھان دو من آٹھ آنے میں ملتے تھے۔ وہ اُن دنوں کی بھی خبریں سناتا ہے جب چھٹی دہائی میں سیلاب آیا اور قحط سالی ہوئی تھی اور لوگ سڑکوں پر مر گئے۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے کشمیر میں طاعون اور ہیضہ پھیلتے دیکھا تھا۔ ان ساری مصیبتوں، قحطوں، آفتوں کی باتیں وہ عمہ وانی کی دکان پر دُہراتا ہے۔ لیکن اُس کو سب سے بڑی مصیبت جوانوں کو اپنے مذہب کی جانکاری نہ ہونا محسوس ہوتا ہے، اُس کو سخت غصہ آتا ہے جب وہ کسی جوان کو دیکھتا ہے کہ اُس نے اپنے بالوں کو کنگھی کر کے گھونسلا بنایا ہُوا ہے۔

''اے ادھ مرے! بالوں کو تتر بتر کردیا ہے۔ اگر پوجا پاٹ کرنے کے لئے کہیں گئے تو جیسے توپ کا نشانہ بنے گا۔ اس نئی تہذیب کی تعلیم نے تم کو تباہ کر دیا ہے۔''

پرکاش کول اپنے دھرم کا سخت پابند تھا۔ مگر اُس کو یہ بھی برداشت نہیں ہوتا کہ نئی نسل کے پنڈت لڑکوں کی طرح نئی نسل کے مسلمان لڑکے بھی بے دین ہو جائیں۔ عمہ وانی

کا بیٹا مدرسے میں پڑھتا تھا۔ وہ نماز نہیں پڑھتا نہ اُس کو خبر ہے کہ اسلام کیا ہے۔ عمہ وانی اپنے بیٹے کو خود نصیحت نہیں کرتا بلکہ اس نے پرکاش کول کو یہ ذمہ داری سونپی۔

''اے نالائق! جتنا بڑا ہو رہا ہے اُتنا ہی بگڑتا جا رہا ہے۔ جا مسجد میں نماز پڑھ۔ جا یادِ خدا کر شاید سیدھا راستہ نصیب ہو۔'' پرکاش کول یوں کہتا ہے جیسے یہ عمہ وانی کا نہیں بلکہ اُس کا اپنا بیٹا ہو۔

عمہ وانی کی دکان اگرچہ گلی میں تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی روزی روٹی کما لیتا تھا۔ اگر سچ مان لیا جائے تو عمہ وانی کو نصف سے زیادہ خریداری پرکاش کول کی بدولت ہوتی تھی وہ اسلئے کہ اگر کسی کو مجلس میں خط پڑھوانا ہو یا خط لکھوانا ہو تو وہ پرکاش کول کے پاس ہی آتا۔ پرکاش کول اپنی برادری کو محض نیک مشورے ہی نہیں دیتا بلکہ اگر کسی کو بدن میں کوئی تکلیف ہو تو اُسے نسخہ بھی دیتا تھا۔

''جناب میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے، سخت مروڑ ہے۔''

''شلغم تو نہیں کھائے ہیں۔''

''جی جناب''

''یہی تو غلطی ہوئی ہے۔ پت جھڑ میں شلغم تب کھانے چاہئیے جب یہ پختہ ہو چکے ہوں۔

ابھی تو شلغم کی پتیاں بھی مکمل طور نہیں کھلی ہیں۔ تم نے کیوں کھائے؟''

''غلطی ہوگئی جناب، اب یہ مروڑ کیسے جائیں گے؟''

''جاؤ دارچینی والا قہوہ پیو، تھوڑا سا گل قند بھی ڈال دینا۔''

ایک دفعہ عمہ وانی کو بانڈی پورہ دعوت پر جانا تھا۔ وہاں اُس کے ایک رشتہ دار کی شادی ہو رہی تھی۔ اُس نے جانے کی مکمل تیاری کر لی۔ صبح کو اُسے امیرا کدل سے بانڈی پورہ جانا تھا۔ پرکاش کول کو نہ جانے کیا سوجھی اُس نے عمہ وانی کو خبردار کیا ہے کہ وہ بانڈی پورہ نہ جائے۔

''وجہ'' عمہ وانی نے پوچھا۔

ہر بات کی وجہ نہیں ہوتی۔ بہتر ہے گھر بیٹھو۔ آج کلمطلع صاف نہیں ہے۔ اس پر طویل فاصلہ طے کر کے دور گاؤں جانا۔ معلوم نہیں وہاں کھانا پینا کیسا ہوگا۔

عمہ وانی کو لگا کہ پرکاش کول کہہ رہا ہے کہ وہاں بڑا گوشت ہوگا۔ لہٰذا اُسے وہاں نہیں جانا چاہئیے۔ مگر وہ جانے کے لئے تیار تھا اور وہاں جانا ضروری تھا۔ اسلئے وہ رخصت ہوا اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ لیا۔

آج اُسے بانڈی پورہ گئے آٹھ دن ہو گئے لیکن وہ ابھی تک وہیں ہے۔ پرکاش کول اپنے گھر میں ہی ہوتا ہے۔ پرکاش کول اور عمہ وانی کی ساری برادری کو سخت تشویش لاحق ہوئی ہے۔ سات دن ہو گئے اُن کو پرکاش کول کی زبانی کوئی خبر سُنے ہوئے۔ عمہ وانی نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ پانچ دنوں میں واپس آئے گا۔ لیکن اب دس دن ہونے کو آئے، اُس کی کوئی خبر نہیں۔

پرکاش کول صبح دس بجے دفتر جاتا اور شام کو چار بجے واپس آکر سیدھے اپنے گھر میں داخل ہوتا تھا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ وہ گھر پہنچتے ہی چائے کی پیالی پی کر آرام کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کئی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ سب پرکاش کول سے عمہ وانی کے بارے میں پوچھتے ہیں لیکن پرکاش کول کچھ نہیں کہتا تھا۔ آخر جب پندرہ دن گزر گئے، برادری نے فیصلہ کیا کہ وہ بانڈی پورہ جائیں گے اور معلوم کریں گے کہ عمہ وانی کو کیا ہوا۔ کیا وہ ٹھیک ہے، بیمار تو نہیں ہے، کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہوا۔ جس دن برادری کے چار آدمی بانڈی پورہ جانے کے لئے تیار ہوئے اُسی دن شام کو ہی عمہ وانی اپنے بال بچوں سمیت واپس گھر لوٹ آیا۔ عمہ وانی کا چہرہ آج بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سوکھ گیا تھا جیسے اُسے قبر سے نکالا گیا ہو۔

''کیا ماجرا ہے؟ تم اتنے دن کہاں تھے؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔

''اوہ کیا بتاؤں، میں کس مصیبت میں مبتلا ہوا تھا۔ یہاں سے جاتے ہوئے صفاپورہ کے قریب ہی گاڑی اُلٹ گئی۔ میں اور میرے بیوی بچے بال بال بچ گئے۔ یہ کہتے

کہتے اُس نے اپنا بازو دکھایا جو زخموں سے بھرا تھا۔ لیکن اب زخم بھر گئے تھے۔ عمہ وانی کے سر پر بھی چوٹ آئی تھی۔

''پرکاش کول کہاں ہے؟'' عمہ وانی نے دریافت کیا۔

''میں یہیں ہوں۔'' پرکاش کول کھانستے ہوئے عمہ وانی کے سامنے آیا۔

پرکاش کول کو دیکھتے ہی عمہ وانی کی آنکھیں بھر آئیں۔

''وجہ'' پرکاش کول نے پوچھا۔

''جناب! اگر اُس دن میں نے تمہاری بات مانی ہوتی یہ حال نہیں ہوتا۔''

''میں نے دیکھا تھا کہ تمہارے واسطے سفر کے لئے نیک ساعت نہیں ہے۔ لیکن تم نے نہیں مانا۔ خیر خدا کا شکر کرو جو بچ گئے۔ مجھے سخت تشویش تھی۔''

اس کے بعد پھر مجلس کا اہتمام ہوتا تھا۔ برادری کے سارے لوگ ایک ایک کر کے عمہ وانی کی دکان پر آتے تھے۔ پرکاش کول بیچ میں بیٹھتا اور سب اُس کی طرف کان دھرے بیٹھتے تھے جیسے ریڈیو کے اِردگرد چھوٹے بچے دائرہ بناتے ہیں۔

☆......صوفی غلام محمد

(کشمیری سے ترجمہ: رؤف راحت)

سلطان تولہ

میں شام سات بجے بون گام پہنچا۔ مجھے بون گام سے آگے چار میل شمال کی طرف جانا تھا۔ چار میل کا یہ سفر پیدل ہی طے کرنا تھا۔ راستہ سخت ناہموار تھا اور مجھے خندقوں اور نالوں سے ہو کر گزرنا تھا۔ ندی نالوں پر کسی کسی جگہ پُل بھی تھے۔ جہاں پُل تھے وہاں سیدھے ہی جانا تھا لیکن جہاں پُل نہیں تھے وہاں ندی نالوں کے بیچ سے گزرنا تھا۔ ایسے تو یہ نالے چھوٹے تھے لیکن ان کے بیچ گزرتے وقت خوف آتا تھا۔ بون گام سے سیدھے ہی نکل پڑا۔ یہ طویل اور پیچیدہ راستہ طے کر کے ٹھیک نو بجے لاڈک پور پہنچ گیا۔ یہاں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ اس کے ساتھ میرے گہرے مراسم تھے۔ یہ جب بھی شہر آتا تو میرے پاس ایک آدھ ہفتہ ضرور ٹھہرتا۔ اس کے لڑکا کا ختنہ کرنا تھا اور اس موقعے پر اُس نے میری دعوت کی تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سارا گاؤں میرا انتظار کر رہا تھا جیسے میں کوئی تیس مار خاں ہوں۔ میرے اس دوست نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں میری تعریفوں کے پُل باندھے تھے۔ ان کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ شہر میں اُس کا کوئی دوست ہے۔ وہ کسی دن میرے پاس قیام کرتا تھا لیکن جب وہ آتا تھا تو کوئی نہ کوئی چیز ضرور ساتھ لاتا تھا۔ سارا گاؤں

میرے استقبال کے لئے آرہا ہے تو میں سوچ رہا تھا کہ اُس نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا۔ خیر میں نے خود سے کہا کہ اے میری جان یہ نظارہ دیکھنا ابھی باقی تھا۔ اس نے میری آمد پر بڑی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ میں اس کے گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں ایک مہمان ہوں یا کچھ اور۔ سب لوگ میری بڑی خاطر مدارت ایسے کرنے لگے جیسے کسی دُلہے کی جاتی ہے۔ مجھ پر شیرینی لٹائی گئی۔ اسپند جلایا گیا۔ دلہے کی آمد پر جو گیت گائے جاتے ہیں وہی گیت میرے لئے گائے گئے۔ یہ سارا نظارہ دیکھ کر میں نے کہا کہ اے خدایا میں کہاں آ گیا۔ مجھے یہ ایک عجیب گاؤں لگا۔ لوگ نہایت سیدھے سادے لگ رہے تھے۔ جو میرے پاس آتا وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ دس بجے کھانا لایا گیا۔ میں تھک چکا تھا۔ چلتے چلتے جیسے میرے سارے اعضا ٹوٹ چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ آئے گا تو میں کہہ دوں گا کہ مجھے کچھ کپڑے دو۔ میں ذرا آرام کر لیتا۔ جب میرا دوست سب کو کھانا کھلا کے میرے پاس آیا تو میں نے کہا: ''یار! بات کل کر لیں گے، فی الحال مجھے کچھ کپڑے دو، تا کہ آرام سے سو سکوں۔''

اُس نے کہا: ''تم دیوانے ہو گیا؟ آج سونا نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا: ''یار میں گانا نہیں سنتا ہوں۔ مجھے گانے سے چِڑ ہے۔ لٰہذا مجھے بخش دو ۔مجھے آرام کرنے دو۔''

اُس نے کہا: ''ہم نے گانے کا انتظام نہیں کیا ہے۔''

میں نے کہا: ''اگر گانا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟''

میرے دوست نے کہا: ''تم آرام سے لحاف کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے رہو، تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ ایک لحاف لے آیا۔ میرے اِرد گرد بہت سے لوگ تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

جس کمرے میں، میں بیٹھا تھا وہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کمرے کے درمیان میں چادر لٹکائی گئی تھی۔ ایک حصے میں، میں بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کہ دوسرے حصے میں کیا تھا۔

کچھ لمحے کے بعد اس کمرے کے درمیان میں جو چادر کی دیوار تھی وہ ہٹائی گئی۔ چادر کے ہٹتے ہی میرے سامنے ایک کمرہ نمودار ہوا۔ ایسے تو یہ اسی کمرے کا دوسرا حصہ تھا لیکن اس وقت یہ دوسرا کمرہ چھوٹا نظر آرہا تھا۔ اس کی دائیں جانب دروازہ تھا۔ پیچھے کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی بند تھی۔ کمرے کے درمیان میں ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ اس میز کے ساتھ ایک کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میز پر سیاہی کی بوتل اور قلم دان سجے ہوئے تھے اور کچھ کاغذ۔ میں حیرت بھری نظروں سے یہ دیکھنے لگا اور غور کرنے لگا کہ یہ میز کس لئے سجائی گئی ہے۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ بائیں جانب کے دروازے سے ایک آدمی تھانے دار کی وردی پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ انتہائی رعب دار اور سنجیدہ تھا۔ اُس نے خوفناک انداز سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کاغذوں کو دیکھنے لگا۔ لمحے بھر کے لئے میں اِسے دیکھتا رہا اور سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ جو دوسرے دیہاتی بھائی بیٹھے تھے وہ بھی اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اُس نے دائیں جانب گردن پھیری اور پھر ہاتھ سے میز کو بجایا۔ ٹھک ٹھک کی آواز سُن کر ایک پولیس والا حاضر ہوا۔ وہ سامنے آکر اُس سے کہنے لگا:

''جناب حکم''

''حاکم کا حکم کیا تھا''

پولیس والا: ''جناب!''

''جناب! مومہ پرے حاضر ہے۔''

تھانے دار: (گرج کے ساتھ) حاضر ہے۔ تو پھر آگے کیوں نہیں آتا ہے؟۔

پولیس والا: جناب! میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔

(پولیس والا پھر باہر نکلتا ہے۔)

دوسرا ایک بزرگ اندر داخل ہوتا ہے۔ پولیس والا آگے آگے اور بوڑھا آدمی سہما سہما پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

تھانے دار: بول سالے، کیا فیصلہ کیا ہے تونے؟

دیہاتی: (عاجزی کرتے ہوئے) میں کیا فیصلہ کروں۔

تھانے دار: تم ابھی بھی کہہ رہے ہو کہ کیا فیصلہ کروں۔

دیہاتی: میں۔۔۔۔۔۔۔۔!

تھانے دار: سالے! سانسیں کیوں اٹک رہی ہیں؟

دیہاتی: دیکھیے تھانے دار صاحب، آپ ہی سوچیے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ آپ میری بیٹی کی طرف بھی دیکھیے اور اس سونہ طوطا کی طرف بھی۔ وہ تو میری بیٹی کا دادا لگتا ہے۔

تھانے دار: (دانت چباتے ہوئے) اچھا، تم ابھی بھی انکار کر رہے ہو۔

(دو آدمی اندر داخل ہوتے ہیں۔)

پہلا آدمی: جناب! ایک گزارش ہے۔ آپ ایک دو سال کے بعد یہاں تشریف لاتے ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ گاؤں میں کیا ہوتا ہے۔ یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ اس بوڑھے نے تو تنازعہ کھڑا کیا ہے۔ اس نے بیٹی کو گھر میں رکھا ہے۔ نہ یہ اُس کا نکاح کرتا ہے اور نہ کچھ۔ لوگوں کے بیچ جھگڑے ہوتے ہیں۔ وہ آئے دن ایک دوسرے کا سر پھوڑتے ہیں۔ کسی دن یہاں بہت خون خرابہ ہوگا۔

دیہاتی: یہ غلط کہہ رہا ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میری ایک بیٹی ہے۔ میں ایک شریف آدمی کی طرح اُس کی شادی ایک شریف خاندان میں کرنا چاہتا ہوں۔

دوسرا آدمی: تمہارے خیال میں سونہ طوطا ایک بدمعاش ہے۔

تھانے دار: اچھا خاموش! میں خود یہ مسئلہ حل کروں گا۔

دوسرا آدمی: جی جناب! آپ یہ مسئلہ جلدی حل کیجئے ورنہ گاؤں میں فساد پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

پہلا آدمی: اگر آپ نے یہ مسئلہ حل نہیں کیا اور مومہ پرے کی بیٹی کسی کے حوالے نہیں کی تو یہاں سخت خطرہ ہے۔ یہاں گردنیں کٹ جائیں گی۔

تھانے دار: آپ مطمئن رہیں۔ میں آج ہی اس کا فیصلہ کروں گا۔ آج ہی اس مسئلے کو حل کروں گا۔ میں اس گاؤں سے تب تک نہیں جاؤں گا۔۔۔ اچھا مومہ پرے! تم یہ مسئلہ حل کرو گے یا میں خود اس کو نپٹا دوں۔

مومہ پرے: میں وہی کروں گا جو شرح اور اسلام کہتا ہے۔ سب سنیئے! جب کسی لڑکی کا نکاح کرنا ہوتا ہے تو پہلے اُسے کہنا چاہیئے کہ ہم تمہارا نکاح فلانی شخص کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں، کیا تمہیں قبول ہے؟ اگر لڑکی نے اس بات کا اقرار کر دیا تو شرح کے مطابق اُس کا نکاح انجام دینا چاہیئے۔ اگر اُس نے انکار کر دیا تو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ چونکہ معاملے نے طول کھینچا ہے۔ گاؤں بھر گمراہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں لڑکی کی رائے دریافت کرنا لازمی بنتا ہے۔

تھانے دار: اے مومہ پرے تم اپنی بیٹی کو ابھی میرے سامنے حاضر کرو۔ میں خود اُس سے اُس کی رائے معلوم کروں گا۔

مومہ پرے: جناب! جناب۔

تھانے دار: جناب جناب کیا کر رہا ہے! جلدی جاؤ گے یا میں اُس کو زبردستی یہاں لے آؤں۔ جاتے ہو یا نہیں؟

مومہ پرے: کل لے آؤں گا اُسے۔

تھانے دار: یہاں تمہارے نوکر نہیں ہیں۔ تمہارے لئے کل تک بیٹھیں گے۔ لڑکی کی نمائش پورے گاؤں کے لئے رکھی ہے۔

مومہ پرے: دیکھیے جناب میں ایک شریف انسان ہوں۔

تھانے دار: تم شریف ہو تو کیا ہم کمینے ہیں۔

مومہ پرے: جناب میں نے ایسا نہیں کہا۔

تھانے دار: پھر جاتا کیوں نہیں ہے؟

مومہ پرے: جاتا ہوں جناب۔

تھانے دار: دیکھو! شام تک واپس پہنچ جانا۔

اچھا! سب اپنے اپنے گھر روانہ ہو جاؤ۔ میں یہ مسئلہ خود سلجھاؤں گا۔ یہ جھگڑا میں خود ختم کروں گا۔ تم لوگ خاموش بیٹھو۔ جاؤ۔

(میز کو اُس نے پھر بجایا تو پولیس والا حاضر ہوا)

پولیس والا: جناب!

تھانے دار: فی الحال دروازہ بند کر دو۔

(پولیس والا دروازہ بند کر کے سامنے آتا ہے۔)

سونہ طوطا نے تم سے کیا کہا؟

پولیس والا: اُس نے کہا کہ وہ پانچ سو روپیے حاکم کو دے گا اگر وہ یہ مسئلہ سلجھائے اور مومہ پرے کی بیٹی کا نکاح کسی بھی طریقے سے میرے ساتھ کروائے۔

تھانے دار: ارے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اگر مجھ سے کہو تو میں مومہ پرے کی بیٹی کو آج ہی حلال کر دوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں نے ایسے بہت سے معاملے دیکھے ہیں۔ کن کن رئیس زادیوں سے میں نے باج وصول کیا ہے۔

پولیس والا: پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟

تھانے دار: میں یہ معاملہ چٹکی بھر میں سلجھاؤں گا لیکن پہلے ــــــــ؟

پولیس والا: پہلے کیا، جناب؟

تھانے دار: پہلے میں اُس کا دیدار تو کر لوں۔

پولیس والا: شوق سے کیجئے حضور!

تھانے دار: اس لئے تو میں نے ان سے کہا۔ سنو! جب اُس کو یہاں لائیں گے تو اُس وقت ان سب کو یہاں سے نکالنا۔ دروازہ بند کر دینا۔ میں اُس کے روئے شریف کو ایک بار بوسہ دینا چاہتا ہوں۔

(دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔ پولیس والا نکلتا ہے۔ تھانے دار بڑی سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ پھر موم پرے اپنی بیٹی لے کر داخل ہوتا ہے۔)

پولیس والا: اے موم پرے! تم باہر ہی رہو۔ وہ اِس سے پوچھ گچھ کرے گا۔ تمہارے سامنے یہ شرمائے گی۔

موم پرے: جی جناب۔ کوئی عذر ہے جناب۔

پولیس والا: میں بھی باہر نکل رہا ہوں۔

(پولیس والا باہر نکلتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے۔)

لڑکی ایک کونے میں دوپٹے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپائے اور گردن جھکائے کھڑی ہوتی ہے۔ اُس نے لال رنگ کا پھیرن اور شلوار پہنا ہے۔ پیروں میں چپل پہنی ہے۔ اس کا انداز دیکھتے ہی سمجھ آتا ہے کہ وہ بے حد حسین ہوگی۔ تھانے دار پہلے اس کا سرتا پا تک جائزہ لیتا ہے۔ پھر اس کمرے کو چاروں طرف دیکھتا ہے۔ وہ جیسے اُتاولا ہو جاتا ہے۔ لمحے بھر کے بعد وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لڑکی یہ دیکھ کر سہم جاتی ہے۔ تھانے دار اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور پھر اُس کے ساتھ لپٹ جاتا ہے۔ پھر وہ اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اُس کے چہرے کو چومنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے چہرے سے دوپٹہ اُٹھا لیتی ہے۔ چہرہ دیکھتے ہی تھانے دار کے قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ لڑکی نہیں بلکہ ایک بوڑھی عورت ہوتی ہے۔ جس کا چہرہ خوفناک ہے۔ وہ تھانے دار سے کہتی ہے:

"کمینے! کُتے!" "تم یہاں مسئلہ سلجھانے آئے ہو؟"

یہ ناٹک جب کلائمکس تک پہنچا، میرے دائیں بائیں جو لوگ بیٹھے تھے ہنس ہنس کے اُن کی پسلیاں دُکھنے لگیں۔ اُنہوں نے تھانے دار کی بہت کھلی اُڑائی۔ وہ میری جانب اس انداز سے دیکھنے لگے جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھا ہم نے آپ کو کیسا ناٹک دکھایا۔ میں نے ظاہری طور اُن کو یقین دلایا کہ میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایسا دلچسپ ناٹک دکھایا۔ لیکن میرے دل میں جیسے آگ لگی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ اِن سب ناٹک دیکھنے والوں کو ابھی ختم کردوں۔ ان کی ایک ایک بات مجھے چھید کررہی تھی۔ مجھے یہ ناٹک دکھا کر میرا دوست اپنے طور خوش تھا کہ اُس نے ایسی چیز دکھائی جو وہ کہیں نہیں دیکھتا۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے دوست کا خون پی جاؤں اور کہوں کہ تمہیں میرے ساتھ یہ دوستی نبھانی تھی یا بدلہ لینا تھا۔ اس رات کو میں خاموش ہی رہا۔ جب رات گزر گئی تو میں صبح تڑکے ہی وہاں سے نکل پڑا۔ کسی کو بھی شک نہیں ہونے دیا۔ گھر جانے کی بجائے میں سیدھا واتھورہ کی جانب چل پڑا۔ واتھورہ پہنچتے ہی میں سلطان تولہ کے گھر میں داخل ہوا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے واپس مڑنا چاہا تو اندر سے آواز آئی۔

ارے کون ہے؟

میں نے پھر اندر جھانکا۔ وہاں کونے میں ایک آدمی کو دبکے ہوئے پڑا دیکھا۔ وہ لحاف اوڑھے تھا۔ شاید بیمار تھا۔ میں نے برآمدے سے ہی آواز دی کہ سلطان تولہ کہاں ہے؟

اُس نے واپس جواب دیا: ''کیوں؟ کیا کام ہے؟''

''چلو اندر آؤ۔''

''مجھے اُسی سے ملنا ہے۔''

''تم اندر آجاؤ۔''

''نہیں اندر آکر کیا کروں گا میں۔ مجھے اُسی سے کام ہے۔''

''چلو آجاؤ تم۔ میں ہی سلطان تولہ ہوں۔''

میں حیران ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ مگر اُس کی آواز سن کر لگا کہ شاید یہی سلطان تولہ ہے۔ میں اندر داخل ہوا اور اُس سے کہا:

''کیا ہے سلطان دادا۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟''

''بڈھاپا ہے اور کیا۔ سمجھو اب مہمان ہوں۔''

''میں نے سلطان تولہ کو دیکھا، وہ تو پاؤں گور میں لٹکائے بیٹھا ہے۔''

سلطان تولہ نے مجھ سے کہا: ''تم کون ہو؟''

''میں کون ہوں؟ کیا بتاؤں، میں کون ہوں۔ اگر تم ہوش وحواس میں ہوتے تو تمہیں خود معلوم ہو جاتا کہ میں کون ہوں۔''

''اگر میں بوڑھا بھی ہو گیا ہوں لیکن ہوش برابر ہے۔ لوگوں کو پہچاننا مجھے آتا ہے۔ تم غلام حسن تھانے دار ہو نا؟''

''میں آج غلام حسن ہوں مگر تھانے دار نہیں۔ لیکن افسوس ہے۔''

''افسوس کس بات کا؟''

''اسی بات کا کہ تم نے تیس سال بعد مجھ سے بدلہ لے لیا۔''

''تیس سال بعد نہیں بلکہ میں نے دو سال بعد ہی بدلہ لے لیا تھا۔''

سلطان تولہ نے کس بات کا بدلہ لے لیا تھا اور کس سے لے لیا تھا۔ میں ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں واتھورہ آیا تھا۔ میں نیا نیا تھانے دار بنا تھا۔ مجھے تھانے داری کا بہت غرور تھا۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مظلوموں کو زدوکوب کیا کرتا تھا۔ میں نے ایک کیس کے سلسلے میں سلطان تولہ کو بھی پورے کا پورا زیرِ تفتیش لایا تھا اور اُس کو مار مار کے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا۔ سلطان تولہ نے جب میرا ظلم وتشدد دیکھا تو وہ مجھ سے کہنے لگا:

''دیکھو غلام حسن! تم نے مجھ پر بہت ظلم ڈھایا ہے اور مجھے سخت ڈرایا دھمکایا

۔ لیکن یاد رکھو کہ میں تم سے ایسا بدلہ لوں گا کہ تم لوگوں میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جاؤ گے۔''

آج جب میں نے ناٹک دیکھا تو میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا سیاہ کارنامہ گھومنے لگا جو میرے ہاتھوں بہت پہلے سرزد ہوا تھا۔ اگر چہ اب میں ایک نیک انسان بن گیا تھا اور ہر غلط کام سے توبہ کر لی تھی مگر سلطان تولہ نے میرے اُس سیاہ کارنامے کو ہر جگہ پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

☆......صوفی غلام محمد

(کشمیری سے ترجمہ: رؤف احمد راتھر)

نُورشالہ

ابھی لالہ کو گزرے چار ہی دِن ہوئے تھے کہ نورشالہ میرے پاس آپہنچا۔ لالہ کے انتقال اور دُنیا کی بے ثباتی پہ ایک طویل وعظ فرما کر کاغذ سے بھری ہوئی ایک گٹھری میرے آگے رکھی اور کہا: ''یہ لو، پڑھو اِسے''۔ میں نے گٹھری کو کھولا۔ اِس میں عدالتی اسٹامپ اور دوسرے کاغذات تھے۔ جبکہ اِن کے اوپر ایک تازہ اسٹامپ تھا۔ میں نے اِسے پڑھنا شروع کیا۔ پہلے تو میں نے اِس پر سرسری نظر دوڑائی۔ لیکن جب میری نظر اِس عبارت پر پڑی، ''منکہ صمد شیخ ولد احمد شیخ ساکنہ صورہ''، میں دَم بخود رہ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آگے کی عبارت پڑھے بغیر ہی میں جان گیا کہ اس میں کیا لکھا ہوگا۔ میں نے کاغذ کی یہ گٹھری نیچے رکھی اور دِل ہی دل میں لالہ کے لئے دوزخ کی دعا مانگنے لگا۔ حالانکہ اُن کے انتقال سے لے کر آج تک میں صبح وشام اُن کے لئے فاتحہ بھیجتا اور دُعائے مغفرت کرتا رہا۔ اے خُدا! اُن کی مغفرت فرما، اُن کی قبر پُرنور کر، جنت الفردوس عطا فرما۔ لیکن اب، اب میں خدا سے اُنہیں جہنم رسید کرنے کی دعا مانگنے لگا۔ میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ نورشالہ بول پڑا، 'کیا پڑھ لیا اسے؟'' میں نے تُند لہجے میں جواب دیا، ''ہاں پڑھ لیا''۔

''تو اب کیا کہنا ہے تمہارا''۔ نورشالہ نے پوچھا؟

''میں کیا کہوں''۔ میں نے غصے میں جواب دیا۔

”کچھ تو جواب دو۔کل جمعہ کی فاتحہ ہے۔میں نہیں چاہتا کہ یہ بات اس چاردیواری سے باہر نکل جائے۔میں نے اندر ہی اندر اس بات کی داد دی اور سوچا کہ معاملہ نازک ہے۔ اگر اِس نے یہ بات سب کو بتائی تو مجھے نورشالہ کے سامنے جھکنا پڑے گا اور یہ دس بیس مرلہ زمین بھی اُس کے حوالے کرنا پڑے گی۔جس کی وجہ سے سماج میں عزت باقی ہے اور جس کی قیمت اس وقت تین چار ہزار روپے ہوگی۔میں نے سوچا اگر میں نورشالہ کو انکار کروں گا تو بات بڑھ جائی گی اور سبھی نورشالہ کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔میں نے معاملے کی نزاکت کو سمجھا اور نورشالہ کا منہ بند رکھنے اور اُسے یقین دلانے کے لہجے میں کہا،”تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟ فی الحال ہمیں اس پریشانی سے آزاد تو ہونے دو۔تم دیکھتے نہیں ہماری حالت۔تمہیں تو ہمیں دلاسہ دینا چاہئے تھا اور تم آگئے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے۔تم ہی سوچو، کیا یہ صحیح ہے؟“تم ہمیں اس غم و یاس کے ماحول سے نکلنے دو۔اس کے بعد جو بھی ہوگا، وہ سُلجھایا جائے گا۔“

نورشالہ یہ سب سُن کر شرمندہ سا ہوا اور کاغذ کی گٹھری اٹھا کر اپنے گھر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی مجھ پر جیسے جنون سوار ہوا۔لالہ کی موت کا غم بُھلا کر میں لالہ اور اُس کے رشتہ داروں کی ہڈیاں اکھیڑنے لگا۔آخری عمر میں کس مصیبت میں ڈال دیا ہمیں۔یہ بھی نہ سوچا کہ اولاد کہاں جائے گی۔

لالہ کی موت سے اگرچہ میں سخت صدمے سے دوچار ہوا، اس صدمہ سے جو باپ کا سایہ اٹھنے سے کسی اولاد کو ہوتا ہے۔لیکن اب ایک اطمینان سا مرے دِل کو حاصل ہوا۔ میں نے سوچا جس چیز کا خطرہ تھا وہ تو ٹل گیا۔کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ زمین عدالتی طور نورشالہ کے نام نہ کردے۔لالہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔خدا نے لمبی عمر عنایت کی تھی۔وہ اگلے وقتوں کی خبریں سُنایا کرتا تھا۔اُسکی ایک ایک بات میرے لئے زندگی کا ایک ایک تجربہ ثابت ہوئی۔اُس کی یہ آپ بیتی، فقط اُس کی آپ بیتی نہ ہو کر جگ بیتی کا احساس دلاتی۔اس میں عام لوگوں کے دُکھ درد کا عکس نظر آتا۔جب وہ پرانے زمانے کی قحط سالی، سیلاب، وبا اور طاعون کا ذکر کرتا تو یہ سب محض اُس کا درد نہ ہو کر زمانے کا درد لگتا۔وہ اپنی

زندگی کے ذاتی کارناموں کا تذکرہ کرتا رہتا۔ وہ گلگت کی اپنی بیگار کا ذکر کرتا اور کہتا، ''دیکھو بچو! یہ زمین جو تمہارے زیرِ استعمال ہے اور جسے تم دو دو ہاتھوں پکڑے ہوئے ہو، یہ زمین ایک وقت میرے لئے کسی مصیبت سے کم نہ تھی۔ یہ زبردستی ہم پر تھوپی جارہی تھی۔ ہم خدا سے اس مصیبت سے خلاصی مانگتے، لیکن خلاصی نہ ملتی۔ ہمیں یہ زمین دے کر گلگت بیگار پر لے جایا جاتا اور ہم یہ سمجھتے تھے ہمیں ہمیشہ کے لئے گھر سے رُخصت ہونا ہے۔''۔۔۔

یہ زمین جو لالہ نے اتنے مصائب جھیل کر حاصل کی تھی، یہی زمین وہ نورشالہ کو دینا چاہتے تھے۔ اسی ایک بات پر میرے اور لالہ کے بیچ پچھلے قریب چالیس سال سے رسہ کشی چلی آرہی تھی۔ جب بھی لالہ نورشالہ کو زمین دینے کی بات کرتا تو میرے تن بدن میں آگ سی لگتی۔ میں صاف کہہ دیتا، ''یہ نہیں ہوسکتا۔'' وہ اپنی ہٹ دھرمی دکھاتا اور میں اپنی ضِد پر اڑا رہتا۔ میں لالہ کے فیصلے کو عملانے کے بیچ دیوار کی طرح حائل تھا۔ حالانکہ لالہ کو بھی یہی غم کھائے ہوئے تھا۔ اُس کے کاندھوں پر مانو ایک بڑا بوجھ تھا، جو ہر گزرتے دِن کے ساتھ بھاری ہوتا جارہا تھا اور جس نے لالہ کو مُوسفید کردیا تھا۔ قریب ستر سال تک تو لالہ اس قدر صحت مند تھا کہ کوئی بھی مشکل کام اُس کے لئے کسی کھیل سے کم نہ تھا۔ وہ دو دِن میں اسلام آباد سے پیدل گھر واپس آتا۔ وہ صبح کو چرارِ شریف کے لئے روانہ ہوتا اور دِن ڈھلے گھر واپس آتا۔ تیس میل اُس کے لئے دو چھلانگیں مارنے کے برابر تھا۔ وہ عمر بھر کسی سواری پر نہ چڑھا تھا۔ ستر سال کی عمر میں بھی اس کے بال کالی رات کی طرح سیاہ تھے۔ لیکن وہ دِن جب زمین کا یہ معاملہ پیش آیا، اُسی دِن سے غم کا دیمک اُسے اندر ہی اندر چاٹنے لگا۔ وہ لالہ جس کی جوانی آگ اُگل رہی تھی، اب آہستہ آہستہ کھوکھلا ہوتا جارہا تھا۔ زمین کا یہ تنازعہ اُس کے گلے کی ہڈی بن چکا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا وجود سمٹ گیا تھا، وہ سکڑ گیا تھا۔ وہ ہر دِن اس بات کا ذکر کرتا، ''ہم نورشالہ کو زمین دے ہی دیں گے''، لیکن ہم ہرگز نہ مانتے۔ پہلے پہل جب یہ بات اُٹھی تو لالہ نے نورشالہ کو زمین دینے کی سعی کی۔ ہم نے اُسے پوچھا، ''تم یہ زمین اُسے کیوں دینا چاہتے ہو؟'' یہ سُن کر لالہ نے ہم سبھی بہن بھائیوں کو بلایا اور کہا، ''دیکھو! آج سے قریب پچاس سال یا اُس سے بھی

پہلے جب میں چھوٹا تھا۔ میری داڑھی بھی نہ پھوٹی تھی۔ اُس وقت۔۔۔ اُس وقت کا میں کیا کہوں۔ یہ محلہ جسے تُم ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکانوں اور مکینوں سے بھرا ہوا دیکھ رہے ہو، جہاں ایک تِل دھرنے کی بھی جگہ نہیں، ایسا نہ تھا۔ یہ ایک وسیع اور کُھلا میدان تھا۔ جہاں سے قریب تین میل تک نظر جاتی تھی۔ یہاں چند ہی مکان تھے۔ دائیں بائیں جو زمین تم دیکھ رہے ہو، اُس میں مکی، تل اور گیہوں ہوا کرتا تھا۔ سہ پہر ہوتے ہی چاروں طرف سے لومڑیوں کی آوازیں کانوں میں گونجتی۔ یہاں اِس جگہ جسے میں تُمہیں نورشالہ کو دینے کے لئے کہہ رہا ہوں، ایک ناشپاتی کا پیڑ ہوا کرتا۔ ساتھ میں سیب اور خوبانی کے بھی چند پیڑ تھے۔ اِس کے ارد گرد انگور کی بیلیں تھیں۔ اس میں سے سال بھر کے لئے اچھا خاصا میوہ نکلتا۔ یہ ایک کھلا باغ تھا جو ہمارا ہی تھا، لیکن یہ جگہ ایک درویش نے اپنی قرار گاہ بنائی تھی۔ جانے اُس کو کیا نظر آیا اِس جگہ میں۔ وہ گاؤں دیہات سے ہو کر اِسی جگہ بیٹھ گیا۔ اِس جگہ، اُس وقت ایک چشمہ ہوا کرتا۔ وہ بزرگ درویش بہت نیک تھا، اُس نے جب یہاں ڈیرا ڈالا تو پہلے ہم سے پوچھ لیا۔ اُس وقت میرا باپ زندہ تھا۔ بزرگ نے اُس سے کہا، ''میں یہاں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اجازت ہے؟'' میرے باپ نے جواباً کہا، ''ارے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ جتنا آپ کو خوش کرے، اُتنا لیجئے''۔ اِس کے بعد اُس بزرگ نے زمین کا یہ ٹکڑا لے لیا۔ اُس نے اس کے ارد گرد کانٹے دار تار لگائی اور اس کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ اِس زمین پر قسم قسم کے پیڑ لگائے اور چند ہی سالوں میں ایک باغ تیار کر لیا۔ یہ جو چنار اور اخروٹ کے پیڑ تُم دیکھ رہے ہو، یہ اُسی باغ کی نشانی ہے۔ باغ تعمیر کر کے وہ اِس جگہ خدا کی عبادت کرنے لگا۔ باغ میں ایک الائچی کا پیڑ لگا تھا، جس پر رات کے وقت پریاں گاتیں۔ اِس جگہ جن آیا کرتے۔ اسی لئے رات کے وقت کوئی بھی اُس طرف جانے سے کتراتا۔ لیکن وہ مردِ خدا اُسی جگہ بیٹھا رہا۔ جو بھی مُسافر کسی دور جگہ سے آتا، اُس کا وہاں سے گزر ضرور ہوتا۔ دور دراز سے آئے ہوئے ایسے مسافر اِس جگہ آ کر گھڑی دو گھڑی ٹھہر کے ہی جاتے۔ یہ باغ اُس نے ایسے ہی مسافروں کے لئے رکھا تھا۔ وہ ہر دِن مکی اور چاول سے بنا مایہ تیار کرتا۔ جو بھی آتا مایہ تناول کر کے آگے چل دیتا۔ جب اُس مَردِ

خدا کا وقت نزع آ پہنچا تو اُس نے میرے باپ کو بلاوا بھیجا اور اُس سے کہا، ''یہ باغ میں نے بنایا ہے۔ لیکن زمین تمہاری ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، تب تک تو یہ باغ میرا ہی رہے گا۔ لیکن آج ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ کیا تُم یہ زمین میرے بیٹے کو دو گے؟'' میرے باپ نے جواباً کہا، ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' بَس یہی وعدہ تھا جو میرے باپ اور اُس مردِ خدا کے درمیان میرے سامنے قرار پایا۔ اِس وقت جو نور شالہ موجود ہے وہ اُسی بزرگ کی چوتھی پیڑھی میں سے ہے۔ اُن چاروں پیڑیوں میں سے ہر ایک سے میں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ زمین اُن کی ہے اور تا ایں دم یہی روایت چلی آ رہی ہے۔ میرے باپ نے وعدہ کیا ہے کہ یہ تم لوگوں کی ہے۔ میں نے بھی وعدہ کیا۔ اَب۔۔۔ اَب تمہیں بھی وعدہ کرنا ہے۔'' جب میں نے یہ سب کچھ لالہ کی زبانی سُنا تو میں نے لالہ سے کہہ دیا، ''تُم کیا کہہ رہے ہو لالہ، تمہارے باپ نے نور شالہ کے پَردادا سے وعدہ کر رکھا تھا کہ یہ زمین تمہاری ہے، کیا اُسی سے یہ زمین اُس کی ہوگئی؟ نہیں وہ وعدہ اَب ٹوٹ چکا ہے۔ اَب یہ زمین نور شالہ کو نہیں ملے گی۔ یہ ہماری ہے۔ یہ تو بندوبست کے کاغذوں میں ہمارے نام درج ہے۔ وہ نور شالہ کیا کر سکتا ہے؟''

''کاغذ جائے بھاڑ میں! اور وہ بندوبست بھی۔ تو کیا وعدہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

''وعدے کی کیا وقعت ہے۔ وقعت تو کاغذوں کی ہے۔''

اگر وقعت کاغذوں کی ہے تو کیا میں اُس کے نام کاغذ لکھ کر دوں۔''

جب میں نے یہ سُنا تو میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ میں نے سوچا، لالہ تو اختیار رکھتا ہے۔ اگر اُس نے لکھ کر دیا تو سمجھو ہم گئے کام سے۔۔۔ میں کچھ سوچنے بیٹھ گیا اور سوچ کر اُس سے کہا، کاغذوں کا کیا کرنا ہے۔۔۔ اب ہم میں سے کون انکار کر رہا ہے۔ ہاں میں سوچ رہا تھا کہ یہ جو روایت سی چلی آ رہی تھی۔۔۔''

''یہ روایت تم لوگوں کو بھی آگے لے جانی ہے۔ جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو تُم اپنی اولاد کو بھی یہی نصیحت کرنا۔''

''ضرور۔ کیوں نہیں۔'' میں نے لالہ کو بظاہر اطمینان دِلاتے ہوئے کہا، ''یہ سوچ

کر کہ فی الحال وعدہ کرنے میں کیا حرج۔ جب وہ وقت آپہنچے گا، تب میں خود دیکھوں گا کہ معاملے کو کیسے نپٹایا جاتا ہے۔ اُس وقت وعدہ، وعدہ کہاں رہے گا۔ اُس وقت بس کاغذ دیکھا جائے گا۔'' لالہ کو میری یقین دہانی سے اطمینان حاصل ہوا اور اِسی اطمینان کے ساتھ وہ اِس دُنیا سے بھی رخصت ہوا۔

اَب یہی وعدہ پورا کرنے کا وقت آچکا تھا۔ لالہ نے وصیت نامہ نورشالہ کے نام لکھ کر دیا تھا، جس میں اُس نے صاف لکھوایا تھا کہ یہ زمین نورشالہ کی ہے اور وہی اِس کا حقدار ہے۔ اِس میں یہ بھی درج تھا کہ وصیت نامہ پر پوری طرح عمل ہونا چاہیئے۔

لالہ کو ابھی چار ہی دِن ہوئے تھے اِس دُنیا سے گئے ہوئے اور یہ چار دِن یہی سوچتے سوچتے گزر گئے کہ لالہ کے وعدے کو پورا کیا جائے یا نہیں۔ اُس پر جب نورشالہ نے وصیت نامہ مجھے دکھانے کے لئے کہا تو میں کچھ زیادہ ہی اضطراب اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ معاملہ تو اُلٹا ہی پڑ گیا۔ جب سامنے زمین پر نظر پڑی تھی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سوچ رہا تھا، ''کیا اتنی زمین میں نورشالہ کو دوں!'' کئی دنوں تک میں اسی تذبذب کی کیفیت میں پڑا رہا۔ سوچتا رہا، ''یہ جو روایت چلی آرہی ہے، کیا اِسے بدستور جاری رکھوں کہ آج اِسے توڑ ہی دوں''۔ اضطراب کے اس عالم میں لالچ، لالہ کو کئے ہوئے وعدے پر غالب آرہا تھا۔ آخر میں نے سوچا، ''میں کیوں خوامخواہ میں اتنا پریشان ہو رہا ہوں۔ لالہ تو چلا گیا، اب مجھے اُس کی وصیت کا کیا کرنا۔ میں نے نورشالہ کو صاف انکار کر دیا۔

''نہیں، زمین نہیں ملے گی۔'' نورشالہ چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا، ''کیا چار پیڑیوں سے چلی آرہی روایت تم نے یکسر توڑ دی؟''۔ میں نے جواب دیا، ''ہاں! ہاں! توڑ دی۔''

نورشالہ پشیمان ہو کر نکلا۔ لیکن یہاں میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ مجھے یہ نہیں لگا کہ لالہ مَر گیا ہے۔ بلکہ یہ کہ ایک دور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ایک زمانے کا خاتمہ۔ سچائی اور ایمانداری کا جنازہ نکل گیا۔۔۔

☆☆☆
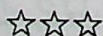
☆......صوفی غلام محمد
(کشمیری سے ترجمہ :رؤف احمد راتھر)

جانے کیوں؟

دس بجے چکے تھے۔سورج بلند و عریض پہاڑ کو پیچھے چھوڑ کر کوہِ سلیمان پر جلوہ گر ہو کر سارے شہر کو تک رہا تھا۔ڈل جھیل کے اندر ہانجیوں نے اپنی اپنی کشتیاں گھاٹ کے نزدیک قطار در قطار لگا دی تھیں۔نشاط سے اُتری گوالیں دودھ سے بھرے مٹکے لے کر گلی گلی کوچہ کوچہ جا کر آوازیں لگا رہی تھیں، ''دودھ لے لو، دودھ۔۔۔'' زونہ بھی ابھی ابھی ٹوکرا بھر کے دھان لے کر نیچے اُتری تھی۔اِسے کوٹنے کے لئے اُس نے دو تین سیر دھان اوکھلی میں ڈال دیئے اور موسل سے آہستہ آہستہ کوٹنا شروع کیا۔آج اُس کے دھان کوٹنے میں وہ تیزی نہیں نظر آ رہی تھی، جو پہلے آتی تھی۔آج اُس کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے۔اُسے اپنا سر بھاری بھاری سا لگ رہا تھا۔موسل اٹھاتے وقت اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سارا آنگن اس کے اردگرد ناچ رہا ہے۔سوچتی تھی آج شالی نہ کوٹ کر چٹائی پر لمبی تان کر سو جائے۔لیکن چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔اِس کے علاوہ چارہ بھی تو نہ تھا۔چار پانچ سیر دھان تو اُسے روز کوٹنا ہی پڑتا تھا۔کوٹنا، صاف کرنا اور پھر سنبھال کر رکھنا، یہ ایک ایسا کام تھا جِسے کل پر نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ویسے شالی کوٹنا اس کے لئے کوئی نئی یا بڑی بات نہ تھی۔اگر وہ چاہتی تو

قریب دس پندرہ سیر شالی ایک دن میں ہی کوٹ لیتی۔ مگر جانے کیوں آج اُس کے بازو بے حس ہو گئے تھے۔ وہ رہ رہ کر موسل اٹھاتی اور سستانے لگتی۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ جب اُسے بھاری لگتا تو وہ اپنی دائیں ٹانگ اوکھلی کے اوپر رکھ کر اپنا ماتھا موسل کے ساتھ ٹیکتی اور ذرا دم لینے کے بعد پھر سے موسل اٹھاتی۔

آج اُسے اپنا وجود اتنا بھاری لگ رہا تھا کہ وہ ایک قدم بھی ادھر اُدھر نہیں ہل سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرغے اور چھوٹے چھوٹے چوزے اوکھلی پر چڑھتے اور دھان چُن کر پھر سے نیچے پَر مارتے۔ وہ آج اُنہیں نہیں بھگا رہی تھی۔ ''دھت تیری کی''۔ ''ستیاناس ہو تمہارا''۔ ''تمہیں چیل کوّے اُڑائیں''۔ دِل سے تو وہ یہ سب کہہ رہی تھی مگر ہاتھ سے انہیں اِدھر اُدھر نکال نہیں پاتی۔ اُسے تو اپنے ہاتھ پاؤں اُسی قدر بھاری محسوس ہو رہے تھے، جیسے اُس کے ہاتھ میں رکھا ہوا لکڑی کا بنا موسل تھا۔

وہ آج موسل بھی ٹھیک سے نہ مار پاتی تھی۔ آج تو کئی بار اوکھلی سے دھان اوپر آ کر نیچے گر پڑا تھا اور اُسے خیال بھی نہ رہا کہ اوکھلی کے دائیں بائیں کتنا دھان بکھر گیا ہے جبکہ اس سے قبل اگر ذرا سا بھی دھان اوکھلی میں سے نکلتا تو وہ جھٹ سے اُسے پھر سے اوکھلی میں رکھتی۔ لیکن آج نہ تو وہ نکلا ہوا دھان ہی جمع کرتی نہ اس کے کام میں آڑے آنے والے مرغوں کو بھگاتی۔ آج اُس کے ساتھ وہ کچھ ہو رہا تھا جو اِس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جانے کیوں؟ یہ تو اُسے خود بھی پتہ نہیں۔ اُسے اب اوکھلی کے قریب کھڑے ہوئے گھنٹہ بھر ہوا تھا جبکہ اُس نے ابھی سیر بھر دھان بھی نہ کوٹا تھا۔ سامنے دھان سے بھرا ہوا ٹوکرا، جیسے اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ سوچتی کاش سارے کوّے، چڑیاں، مینا اور بلبل اکٹھے آتے اور اِس ٹوکرے پر ٹوٹ پڑتے تاکہ یہ ختم ہو جاتا اور میں آزاد ہو جاتی۔

آج اُسے رہ رہ کر اپنے میکے کی یاد آ رہی تھی۔ میکے کا وہ سبزیوں کا باغیچہ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا جس میں وہ خود ساگ، مرچی مٹر اور ٹماٹر وغیرہ اُگایا

کرتی۔

آج تو اُس کی بھوک بھی ختم ہوگئی تھی۔ ورنہ تو وہ دھان کوٹتے کوٹتے، پاؤ بھر چاول کھا بھی جاتی۔ مگر آج، آج تو اُسے چاول بھی کنکر ہی لگتے، سخت اور بدمزہ کنکر۔ اُسے ہر چیز سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ نہ کھانے کو جی چاہ رہا تھا نہ پینے کو۔ اگر کسی چیز کی چاہ تھی تو وہ ہے سُرخ سُرخ کھٹے کھٹے ٹماٹروں کی۔ وہ آرزو کرتی کاش میرا بھائی آتا، اُس سے کہتی کہ دو چار موٹے موٹے ٹماٹر کہیں سے لے کر آؤ۔ کھٹائی کی اُس کی چاہ ایسی ہی تھی جیسے پیاسے کو پانی کی۔ آج اُس کے دِل میں نئے نئے اور عجیب عجیب خیالات جنم لے رہے تھے۔ جن چیزوں کو وہ ناپسند کرتی، آج وہ اُسے اچھی لگنے لگی تھیں اور جو چیزیں اُسے پہلے اچھی لگتی، آج وہ اُسے ایک آنکھ نہ بھا رہی تھیں۔ شادی کے بعد تو وہ میکے کا نام بھی نہ لے رہی تھی، اِس قدر محبت تھی اُسے اپنے شوہر سے۔ وہ تو ایک پَل بھی اُن سے دور رہنا برداشت نہ کر پاتی۔ مگر آج اُسے اپنے عزیز شوہر کا گھر نہیں بلکہ اپنے ماں باپ کا مسکن رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔ کاش میری ماں اِس وقت میرے سامنے ہوتی تو کہتی، ''ماں یہ کیا ہو رہا ہے مجھے۔'' چھوٹی بہن سامنے ہوتی تو کہتی، ''بہنا، ذرا میری کمر تو دبانا، کمر دُکھ رہی ہے۔'' وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ پیچھے سے اُس کی بڑی دیورانی جانہ آ پہنچی۔

''افوہ خدایا! تُم نے تو ابھی کچھ کیا ہی نہیں ہے۔''

''ہاں۔ اور کیا۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔'' زونہ سُستا کر اور ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' جانہ نے قریب آکر پوچھا۔

''کچھ نہیں، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔''

''کب سے؟ تُم تو چہرے سے بھی بجھی بجھی لگ رہی ہو''۔ جانہ نے مُوسل اُس کے ہاتھ سے لیتے ہوا کہا۔

''آج صبح سے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا ہے۔ سب کچھ گھومتا ہوا سا لگ رہا ہے۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہی ہوگا۔ مُوسل ہاتھ میں لو۔ ڈائن آ رہی ہوگی۔'' زونہ نے دوسرا موسل ہاتھ میں اُٹھایا اور دونوں عورتیں دھان کوٹنے لگیں۔

''زور زور سے موسل دے مارو''، جانہ بیچ میں بول پڑی۔

''بازُو ہی نہیں اُٹھ رہے۔ جانہ نے آستین اوپر کی اور تھوک مار کر اِسے دونوں ہاتھوں پر ملا اور مُوسل مارنا شروع کیا۔ اِس کی ضربوں سے اوکھلی لرز اٹھی۔ ''شاباش'' کہتے کہتے اُس نے زونہ کو مائل کرنا شروع کیا اور وہ بھی تھکے تھکے بازؤں سے مُوسل چلانے لگی۔''

''شاباش! زور سے اور زور سے ۔۔۔۔ رَب سب ٹھیک کرے گا۔'' زونہ بھی زور زور سے مُوسل چلانے لگی۔ تیز تیز ضربوں کی آواز سے مُرغے مرغیاں بھی پیچھے ہو گئے اور دھول چوکر بھی اُوپر آنے لگی۔

تیز تیز ضرب مارنے سے زونہ کے بازو مُتحرک ہو گئے۔ بندھے ہوئے گھٹنوں میں لچک پیدا ہوئی۔ جیسے کسی حکیم نے اُسے دوائی کی ایسی پُڑیا کھلائی کہ جس سے اُس کا سارا درد کافور ہو گیا۔

اُوکھلی پھر سے لَرزنے لگی۔

دونوں عورتیں جوش میں گُنگنانے لگیں،

''میری جاناں''

''سبحان اللہ''

''جانِ جاناں''

''سبحان اللہ''

ایک مصرعہ جانہ گاتی تو دوسرا زونہ۔ گاتے گاتے اُنہیں پتہ ہی نہ چلا کہ

دھان سے بھرا ہوا ٹوکرا کب خالی ہوا۔ اب صرف اوکھلی بھر دھان ہی رہ گیا تھا۔ دونوں ایک لمبی آہ بھر کر اور مُوسل اوکھلی سے رکھ کر نیچے بیٹھ گئیں۔ دونوں کی سانس پھول رہی تھیں، چہرے سرخ ہو گئے تھے اور سارا بدن پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ اُوکھلی کے آس پاس ٹوکری بھر گرد جمع ہوئی تھی۔

''تمہاری تو آنکھیں بھی سرخ لگ رہی ہیں''۔ جانا بول اٹھی۔

''ہاں آنکھیں بھی بوجھل ہو گئیں ہیں۔''

''کچھ کھانے کو جی چاہ رہا ہے''؟

''بالکل بھی نہیں''۔

''بھات کھانے کو؟''

''نہ، اُس کی اور بھی نہیں''

''پھر کیا کھانے کو رغبت ہے؟''

''کسی چیز کی نہیں۔ جیسے بھوک ہی مٹ گئی ہے''

''پھر بھی کھٹا وٹا کھانے کو؟''

کھٹا نام سُنتے ہی زونہ ہونٹ گیلے کرنے لگی۔

''ہاں۔ چاہتی ہوں ٹماٹر ایک دو اگر مِل جائیں تو چٹنی بنا کر کھالیتی۔''

جانہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

''کہہ دو کہ تمہیں کیا کیا ہو رہا ہے۔''

''ذرا بول''

''ہاتھ پاؤں ٹوٹ جیسے گئے ہیں۔''

''اور سنو''

''چاہتی ہو کہ کہیں مِٹ جاؤں۔''

''لو سُنو''

''پیٹ میں درد ہو رہا ہے''

''ہُنہ ---''

''اور بھی کہوں گی، پہلے بتاؤ اِن سب باتوں کا جواب ''ہاں'' ہے نا۔

''یہ سب تو میں نے خود ہی کہا''

''اچھا! کیا یہ بھی چاہتی ہو نا کہ کچھ دن میکے جا کر آرام کروں۔''

یہ سُن کر زونہ کے پیروں تلے جیسے زمین نکل گئی۔ ''اِسے یہ کیسے پتہ چلا۔''

''کیوں، چاہتی ہو کہ میکے چلی جاؤں، کچھ دِن؟''

''ارے ہاں، لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''ایسے ہی، تمہارے چہرے سے''

''نہ نہ، تمہیں میری قسم، سیدھے سیدھے بول''

''جانہ کی ہنسی نکل گئی۔ اُنگلی دانتوں تلے دبا کر وہ بولی، ''تمہیں تو وہ ہوا ہے۔'' جانا لفظ ''وہ'' کو لمبا کھینچ کر بولی۔

''کیا ''وہ''۔ زونہ حیران ہو کر بولی۔

''مجھے کیا پتہ، کیا ہوا ہے۔ بیمار ہوں اور کیا۔''

''ہاں --- وہی بیماری'' جانہ ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔

''اور کہوں۔ کیا کیا ہوتا ہے؟''

''ہاں بول''

''چکر آرہے ہیں۔ اُلٹیاں سی آرہی ہیں۔''

''نہ نہ وہ نہیں ہو رہا ہے۔'' یہ پہلی بات تھی جسے زونہ نے انکار کیا تھا۔

''اچھا چھوڑ، ایک بات اور پوچھوں؟''

''پوچھ''

''تمہیں اس مہینے نہیں ہوا؟ ---''

''کیا؟''

''وہی، جو ہر عورت کو ہر مہینے بعد ہوتا ہے''۔

یہ سُن کر زونہ اچانک سوچ میں پڑ گئی جس طرف اُس کا دھیان نہ گیا۔ اُسی طرف جانہ نے دھیان دِلایا۔

''ارے ہاں۔ اِس مہینے تو مجھے ہوا ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ سے ہی کہنے لگی''

''کیوں۔ سچ کہانا''۔۔۔ جانا پھر پوچھ اُٹھی۔

''تو اُس سے کیا ہوا۔ اگر نا بھی ہوتا''

''اُس سے وہی ہوتا ہے جو تمہیں خود پتہ ہے''۔

''میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا'' زونہ معصومیت سے بولی۔ جانہ نے سوچا شاید یہ جان کر انجان بن رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہی تھی کہ زونہ اِس چیز سے نا آشنا تھی۔ وہ پھر سے جانہ سے پوچھ بیٹھی۔

''تمہیں میری قسم۔ اُس سے کیا ہوتا ہے؟''

''خود پتہ چلے گا۔ ہونے دو، دو چار مہینے''۔

''ہُنہ۔۔۔ ہٹ ذرا جا!! مجھے 'وہ' نہیں ہوا ہے۔'' زونہ شرم سے سَر نیچے کئے ہوئے بولی۔

''تمہاری قسم، تمہیں وہی ہوا ہے''۔

دھان کُٹائی کر کے زونہ جھٹ سے اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے کُنڈی لگا کر سوچنے لگی۔ اُسے جانہ کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ وہ خیالوں میں کھو گئی۔ مجھے یہ کیسے ہوگا؟ میں تو ابھی چھوٹی ہوں۔ اُسے یاد آیا کہ پچھلے سال کیسے وہ شادی سے پہلے نبلہ، حنیفہ، ہاجرہ اور فاطمہ کے ساتھ کھیلتی رہتی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ حلقہ باندھ کر ناچتی گاتی۔ اُسے لگتا جیسے وہ کل ہی یہاں آئی ہے۔ اُس کے ناخنوں پر ہنوز کہیں کہیں اُس مہندی کے نشان باقی تھے جو شادی کے روز رچائی گئی تھی۔ پھیرن بھی

وہی پہنا تھا جو اُس نے شادی کے سات دن بعد، میکے سے واپس سسرال پہنچنے پر پہنا تھا۔ زونہ نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی، لیکن اُسے کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ وہی ہاتھ، وہی پاؤں، اُس نے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آہستہ آہستہ اِس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ لیکن اُسے کچھ خاص نظر نہ آیا۔ اُس نے پھر اپنے پھیرن کے گریبان پر نظر دوڑائی۔ اُس نے اِس پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ لیکن ایک دَم سے وہ جیسے چونک گئی، اُسے اپنے سینے پر اُبھار جیسا دِکھائی دیا۔ ''یہ کیا''۔ یہ کیسے ہوا''۔ پچھلے سال تو اس کا سینہ اتنا ابھرا ہوا نہ تھا۔ اُسے یاد آیا جب پچھلے سال اُس نے یہی پھیرن شادی کے دِن پہنا تھا، تو یہ اس کے جسم پر جیسے لٹک گیا تھا۔ اُس روز اُسے پھیرن کے اندر اپنا جسم بہت چھوٹا اور پتلا دکھائی دیا تھا، لیکن آج، آج اُسے کچھ اور دیکھنے کو ملا۔ پھیرن چھوٹا اور جسم بڑا۔ وہ شک میں پڑ گئی۔ مگر اس سے کیا، یہ تو شادی کے بعد ہوتا ہی ہے۔ راجہ کو بھی تو ہوا ہے۔ میمونہ کو بھی۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی جانہ کی بات پھر اُس کے ذہن سے ٹکرائی۔

''تمہاری قسم، تمہیں وہی ہوا ہے۔'' جانہ نے یہ بات کیسے بولی آج تک تو ایسا نہیں کہا۔ آج کیوں کہا۔ اُسے مجھ میں کیا نظر آیا۔ وہ پھر سے اپنے سراپا پر نظر ڈالنے لگی۔ جانہ تو اکثر مذاق کرتی ہی رہتی ہے، آج بھی مذاق ہی کیا ہوگا۔ ورنہ مجھے کیا ہوا ہے۔ میں تو ابھی چھوٹی ہوں۔ مجھے کیسے ہوگا۔ وہ تو ایسے ہی کہتی ہے۔۔۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ کیوں گئے ہیں۔ سَر کیوں پھٹا جا رہا ہے۔ چکر کیوں آ رہے ہیں۔ یہ سب تو پہلے نہ ہوتا تھا۔ یہ کیوں۔ ''آج کیا ہوا ہے مجھے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا جیسا کیوں ہے۔ کیوں یہ سارا کمرہ گھومتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لے کر قدم اٹھانے لگی۔ اُس کی نظر اچانک آئینے پر پڑی جو دیوار پر آویزاں تھا۔ اُس کے چہرے پر سیاہی جیسی چھا گئی تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ آنکھوں میں پیلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ پھر سے شک میں پڑ

گئی۔ جانہ نے سچ ہی کہا ہے۔ اُس کی بات مذاق نہیں ہے۔ ایسی بات وہ مذاق میں کرسکتی۔ اِس سے پہلے تو نہ کیا۔

ویسے درد یا مرض تو اِنسان کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔ اب کیا یہ ضروری ہے کہ 'وہی' بات ہوگی۔ ہوسکتا ہے ہوا لگ گئی ہو یا ناف کھِسک گئی ہو۔ لیکن ناف تو کسی اونچی جگہ سے چھلانگ مارنے، گر جانے سے کھِسکتی ہے۔ میں کب گر پڑی۔ میں نے کب چھلانگ لگائی۔ ہاں، پرسوں میں سیڑھی سے نیچے گری تھی۔ ہوسکتا ہے، یہ اُسی سے ہوا ہو۔۔۔ مگر، مگر اِس مہینے مجھے کیوں نہیں ہوا۔۔۔ مجھے تو ساتویں تاریخ کو ہی ہوتا تھا۔ آج تو ستائیسویں تاریخ ہے۔۔۔ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ اِس سے پہلے تو نہ ہوا۔ مگر اس سے کیا ہوا۔ شادی سے پہلے بھی تو کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ اِس مہینے بھی نہیں ہوا۔ ہاں! میری ناف ہی کھسک گئی ہے اور کچھ نہیں۔ میں خواہ مخواہ وسوسوں میں گھرتی جارہی ہوں۔ لیکن جانہ کو کیسے پتہ چلا۔ اُس نے مجھے کیسے کہا۔ اُسے یاد آیا:

"دیکھ زونہ تو چاہتی ہے نا کہ کچھ دن میکے جا کر آرام کروں"۔

اُسے کیا کشف تھا۔ جب تک نہ اُسے مجھ میں کچھ ایسا نظر آیا۔ اس نے یہ بات کیسے کہی۔ درد تو چہرے سے ہی جھلکتا ہے، لیکن یہ باتیں اُس نے کیسے جان لیں۔ اُس نے کیسے جان لیا کہ اِس مہینے مجھے نہیں ہوا ہے۔ اُس نے کیسے بھانپ لیا کہ میں میکے جانا چاہتی ہوں۔ نہیں۔۔۔ ضرور کچھ بات ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ سے گئے ہیں۔ کچھ کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے۔ میکے کی یاد آرہی ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے۔ کچھ تو ہوا ہے مجھے لیکن اتنی جلدی مجھے کیسے ہوسکتا ہے۔ ابھی تو میں چھوٹی ہوں۔ پچھلے سال ہی تو شادی ہوئی۔ ابھی کتنا وقت ہوا۔

وہ تذبذب کے صحرا میں آوارہ پھر رہی ہیں۔ کبھی گرتی، کبھی اٹھتی، کبھی یہ کہتی کہ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے اور کبھی یہ سوچتی کہ کچھ نہ کچھ تو ہے۔ وہ اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا تھی کہ اُسے چکر آنے لگا۔ اُسے کمرہ تیز تیز گھومتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لرز

سی اٹھی اور ایک دَم سے نیچے ،گر پڑی۔سر سے لے کر پاؤں تک پسینے میں غرق ہوئی۔ وہ زور سے ماتھا پکڑنے لگی۔ ذرا دیر بعد وہ پھر سے ہوش میں آئی اور اپنے دائیں بائیں نظر دوڑانے لگی۔ اُسے لگا کہ اُس کے پیٹ میں کوئی چیز تیر رہی ہے۔ جو کبھی اوپر کبھی نیچے آرہی ہے۔ اُوہہ۔۔۔ مجھے تو اُلٹیاں سی آرہی ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے اُس نے اپنا مُنہ کھولا۔ اُس کے منہ سے پانی سا نکلنے لگا، جس سے سارا پھیرن بھیگ گیا۔ ''نہ ،نہ ،نہ، جانہ نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔'' اُسے اب یقین ہو چلا۔ وہ سَر سے پاؤں تک اپنا جائیزہ لینے لگی۔ اُسے پھیرن کے اندر بدلاؤ نظر آیا۔ وہ اچانک چونک پڑی۔

''دروازے کے باہر کوئی کھڑا تھا۔''

''اَرے دروازہ تو کھولو۔ تُم کنڈی لگا کر کیا کر رہی ہو اندر؟'' یہ اُس کے شوہر کی آواز تھی۔ زونہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ''اٹھے کہ نہیں۔'' اُسے جانے کیوں شرم سی آرہی تھی۔

☆☆☆
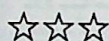
☆......صوفی غلام محمد
(کشمیری سے ترجمہ: روف احمد راتھر)

احمد ریشی

احمد ریشی کا نام سُنتے ہی لگتا ہے کہ یہ کوئی بُلند پایہ پیر یا فقیر ہونا چاہئے۔ مگر احمد ریشی نہ تو پیر ہے نہ کوئی فقیر۔ نام اِس کا اسلئے معتبر لگتا ہے کہ اس کے ساتھ لفظ ''ریشی'' جُڑا ہوا ہے۔ ویسے ریشی عموماً چرارِشریف یا پکھر پورہ میں نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے احمد ریشی کا دادا یا پردادا کسی آستانہ کا ریشی رہا ہو۔ تاہم شہر میں آکر اب اِن کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا ہے۔ یہ اب کاروبار اور نوکری وغیرہ کر رہے ہیں۔ احمد ریشی بھی محنت مزدوری کر رہا ہے۔ مگر اِس کے علاوہ اُسے ایک اور چسکہ پڑ گیا ہے۔ جو نہ پیروں کا شیوہ ہے نہ فقیروں کا طریق۔ اگر کسی فردِ بشر سے یہ کہیں گے کہ احمد ریشی فُٹ بال کھیلنے والا ایک کھلاڑی ہے تو وہ یقیناً ہنس پڑے گا۔ ایک ریشی اور کھلاڑی کا آپس میں کیا ربط؟ تاہم یہ حقیقت ہے کہ احمد ریشی ایک کھلاڑی ہے مگر اُس نے کسی بھی بین الاقوامی مقابلے میں حصہ نہیں لیا ہے۔ اُسے پتہ ہی نہیں کہ اسٹیڈیم کیا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی مقابلہ کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود احمد ریشی کو کھیلنے کا شوق ہے۔ اُس کی رَگ رگ میں ایک کھلاڑی کا خون دوڑ رہا ہے۔ اُسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرتا اور کھیلتا ہے۔ وہ گلی کوچوں، چوراہوں، صحنوں اور میدانوں میں کھیلتا نظر آتا ہے۔ میں خود احمد ریشی کے ساتھ کھیلا ہوں۔ آج میری عمر یہی کوئی 26 یا 27 کے آس پاس ہوگی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں مدرسہ جاتا تھا۔ تب سے قریب سولہ سال گزر گئے۔ ایک

انقلاب بپا ہوا۔ تب سے زندگی میں قدریں بدل گئیں، لوگوں کی چال ڈھال، رنگ ڈھنگ سب بدل گئے۔ جو بچے تھے وہ بڑے ہوئے۔ جو جوان تھے وہ بزرگی کے عالم میں پہنچ گئے۔ پس اُن دِنوں بچہ تھا، اَب بچے والا ہو گیا ہوں۔ جو اُن دِنوں میرے ساتھ پڑھتے یا کھیلتے تھے، اُن میں آج کچھ میری طرح نوکری کر رہے ہیں اور کچھ کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ سترہ سال کی زندگی کے طویل وقفے میں کوئی ایک طرف تو کوئی دوسری سمت کو پہنچا۔ بچپن کا وہ ساتھ چھوٹ گیا۔ تب تو دن گلی کوچوں، آنگنوں اور میدانوں میں گزرتا۔ صبح کو مدرسہ جاتے اور دوپہر کے بعد کسی نہ کسی بہانے اسکول سے بھاگ نکلتے۔ کتنا خلوص تھا تب زندگی میں! بچے اِکٹھے کھیلتے، اُچھلتے کودتے تھے۔ کوئی فرق نہیں تھا آپس میں۔ نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا۔ جیسا احمد ریشی تھا ویسا میں بھی تھا۔ جیسا علی، حبیب اور بشیرہ تھا ویسا میں بھی تھا۔ سب ایک جیسے تھے۔ لیکن سترہ سال کی زندگی میں سب آشنائی ختم ہوگئی۔

میری زندگی میں بھی کافی نشیب وفراز آئے۔ اب میں گلیوں کوچوں میں کھیلنے والا کوئی آوارہ بچہ نہیں رہا بلکہ آج بچے مجھے دیکھ کر دیواریں پھلانگتے ہوئے چھپ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شریر بچہ کچھ زیادہ ہی شرارت پہ اُتر آئے تو اُس کو ایسی کان پکڑی کراتا ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ زندگی کا یہ اُلٹ پھیر بہت عجیب ہے۔ نہ چھوٹا، چھوٹا ہی رہ جاتا ہے اور نہ بڑا بڑا۔ مگر احمد ریشی نہ تو چھوٹا ہے نہ بڑا۔ احمد ریشی آج بھی وہی احمد ریشی ہے جو آج سے سولہ سال پہلے تھا۔ جب ہم بچپن میں کھیلتے تب بھی احمد ریشی ہم سب میں عمر کے لحاظ سے بڑا ہی تھا۔ اُسے فٹ بال کھیلنے کے کرتب خوب آتے۔ کھیلتے وقت اُس کے پاؤں دونوں طرف سے اٹھتے۔ ہیڈ (Head) مارنے میں، ساتھیوں کو پاس دینے میں، کِک روکنے میں اور دوڑ لگانے میں احمد ریشی سب سے ماہر تھا۔

احمد ریشی کا یا اپنی زندگی کا یہ قصہ مجھے اس لئے بتانا پڑا کہ آج سولہ سال کے بعد مجھے اپنے مکان کے آس پاس کچھ شک آور چیزیں دِکھائی دیں۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ احمد ریشی تھا جو کبھی چھپ جاتا، کبھی عیاں ہوتا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح سایے کی طرح

منڈلاتا رہا۔ مجھے شک سا ہوا۔ کہیں یہ کسی چیز کو لے جانے کی تاک میں تو نہیں؟ نہیں، نہیں، چوری کرنا اُس کی فطرت نہیں۔ بچپن میں بھی اِس نے کبھی چوری نہیں کی۔ لیکن پھر یہ اس طرح چوری چھپے کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس کا یہاں کیا کام؟ احمد ریشی کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے میں نے کھڑکی میں سے اپنا سَر باہر نکالا۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ لیکن سَر نیچے کئے ہوئے وہ دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ میرا شک اب اور گہرا ہوا۔ مجھے لگا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

بچپن میں بھی احمد ریشی کھیلنے کیلئے میرے گھر، مجھے بُلانے آتا تھا۔ وہ دور سے سیٹی مارتا۔ میں سمجھ جاتا کہ یہ احمد ریشی ہے۔ میں کھڑکی یا دیوار پر سے چھلانگ مار کر احمد ریشی کے ساتھ فٹ بال کھیلنے نکلتا۔ آج مجھے یاد آیا۔ یہی خزاں کے دِن تھے۔ کالج گراونڈ میں پولیس اور فرنڈس کے درمیان میچ ہونا تھا۔ اس دن فائنل تھا۔ لوگوں کو کل سے ہی میچ دیکھنے کی للک تھی۔ میں گھر میں ضد کرنے لگ گیا کہ آج کالج میں میچ ہے۔ حالانکہ اُنہوں نے مجھے آج گھر سے باہر نکلنے کو منع کر رکھا تھا۔ لیکن میں نے احمد ریشی کو کہہ رکھا تھا کہ تین بجے گھر سے باہر نکلوں گا۔ احمد ریشی ٹھیک تین بجے آدھمکا۔ دُور سے ہی ہلکی سی سیٹی ماری۔ میں چوری چھپے گھر سے نکلا۔ کالج گراونڈ میں لوگوں کا ہجوم اُمڈ آیا تھا۔ لوگ چناروں پر چڑھ گئے تھے۔ دیواروں پر تماشہ بینوں کی لمبی لمبی قطاریں دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ ہم چونکہ چھوٹے تھے لہٰذا کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ پاسکے۔ ہم نے میدان کے چاروں طرف چکر لگائے لیکن جگہ ندارد۔ احمد ریشی بھی مایوس ہوا اور میں بھی۔ میچ شروع ہونے میں اب کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ ریفری نے جوں ہی سیٹی ماری، لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کیا۔ اِسی شور شرابے میں احمد ریشی نے میری بانہیں پکڑ کر مجھے تماشہ بینوں کی ٹانگوں کے نیچے سے اندر کی طرف دھکیلا اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف لے گیا اور میرے ساتھ خود کے لئے بھی بیٹھنے کی جگہ نکالی۔ یہ حرکت دیکھ کر ایک شخص غصے سے لال پیلا ہو گیا اور احمد ریشی کو اٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش کی۔ لیکن احمد ریشی نے کافی منت سماجت کی۔ وہ شخص بھی بالآخر نرم پڑ گیا۔ اِسی اثناء میں میچ بھی شروع ہوا۔ کھلاڑی میدان کے چاروں طرف

چھا گئے۔ فرنڈس اور پولیس دونوں ٹیموں کی اُلگ الگ وردیاں تھیں۔ دونوں ٹیمیں اگر چہ مضبوط تھیں، تاہم لوگ فرنڈس کی جیت کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ پولیس کی ٹیم ہار جائے۔ شاید اس لئے کہ اُن دِنوں لوگ پولیس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب بھی کوئی کھلاڑی چالاکی اور ہوشیاری سے بال کو آگے لے جاتا تو ایک شور سا بپا ہوتا۔

شاباش بطخ! شاباش بندر! یہ وہ نام تھے جو لوگوں نے اپنے محبوب کھلاڑیوں کے لئے رکھے تھے۔ اگر کبھی میچ میں پولیس کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا تو لوگ دَم بخود رہ جاتے۔ فرنڈس عوام کی ٹیم تھی۔ لوگ اِسے تہہ دل سے پسند کرتے تھے۔ فرنڈس کی جیت لوگوں کی جیت اور اُن کی ہار گویا لوگوں کی ہار تھی۔ لیکن احمد ریشی کا نظریہ کچھ مختلف تھا۔ وہ میدان میں اُس کھلاڑی کے لئے تالیاں بجاتا اور شاباشی دیتا، جو اچھا کھیلتا۔ چاہئے وہ پولیس کا کھلاڑی ہو یا فرنڈس کا۔ ایک بار پولیس کے سینٹر ہاف کے ہاتھوں بال لگ گئی۔ اُس نے دائیں طرف کے اپنے دوسرے ساتھی کو پاس دِیا۔ وہاں سے بال کو پھر سے سینٹر ہاف کی طرف گھمایا گیا۔ اب بال گول کے نزدیک پہنچ گئی۔ سینٹر ہاف نے بال کو کچھ ایسے زور سے کِک مارا کہ گول کیپر کی آنکھوں کے سامنے گویا اندھیرا چھا گیا اور بال جال کے ساتھ لگ گئی۔ ریفری نے وِسل بجائی۔ پولیس گول داغنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ تمام تماشہ بینوں کے چہروں پر مردنی سی چھا گئی۔ مگر ایک احمد ریشی تھا جو تالیاں بجا بجا کر پولیس کو شاباشی دے رہا تھا۔ اگر چہ لوگ اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر وہ اِس سے بے پرواہ صرف میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا مگر بال گھومنے کے ساتھ ساتھ اُس کا سر بھی گھوم رہا تھا۔ اگر کوئی کھلاڑی زور سے کِک مارتا تو بے وجہ اُس کے پیروں میں حرکت پیدا ہوتی۔ اگر کسی کھلاڑی کو بال پکڑنا یا آگے لے جانا نہ آتا تو احمد ریشی دانتوں تلے اُنگلی دباتا۔ اس وقت وہ کہتا، کاش میں اِس کی جگہ ہوتا تو دِکھاتا کہ کِک کس طرح مارنی ہے اور کھلاڑی سے بال کس طرح چھیننی ہے۔ احمد ریشی کی یہ حرکتیں دیکھ کر لوگ ہنس پڑتے۔ جب وہ پولیس کے کسی کھلاڑی کی تعریف کرتا تو لوگ گالیاں بکتے۔ احمد ریشی حیران تھا کہ لوگ کیوں پولیس کی تعریف نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اُن کے کھیلنے کی کیوں داد نہیں

دیتے؟ وہ کہتا، داد کھیلنے کی ملنی چاہیئے نہ کہ ٹیم یا کھلاڑیوں کو۔ لیکن لوگوں کو اُس کی یہ باتیں راس نہ آتیں۔

یہ بچپن کا وہ واقعہ ہے جو مجھے آج بھی بخوبی یاد ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ لیکن آج میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ احمد ریشی میرے گھر کے باہر کیا کر رہا ہے۔ اس کا یہاں کیا کام۔ یہ کِس کا انتظار کر رہا ہے۔ اگر اِسے مجھ سے کچھ کام ہوتا تو سیدھے میرے پاس آتا۔ اِس کی یہ حرکات جانچنے کیلیئے میں نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف کو آواز دی۔ میں حیران تھا کہ ابھی تک تو یوسف نیچے کمرے میں پڑھ رہا تھا، اتنی ہی دیر میں یہ کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے پھر سے آواز دی، مگر جب وہاں سے کوئی جواب نہ ملا تو میں نیچے آ گیا۔ یہاں کمرہ خالی تھا۔ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک کاپی پر دوات الٹی پڑی تھی، جس کی سیاہی ابھی بھی کاپی پر تیر رہی تھی۔ غضب ناک ہو کر میں پھر سے اُوپری منزل پر چڑھ گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ احمد ریشی غائب تھا۔ لیکن دور سے مجھے سڑک کی طرف دو آدمی دوڑتے نظر آئے۔ میں بہ غور دیکھنے لگا، یہ احمد ریشی اور یوسف تھے۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ احمد ریشی اور یوسف کا آپس میں کیا کام۔ میں نے زور زور سے آواز دی ''یوسف! یوسف!'' یوسف نے مُڑ کر دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے ہاتھ سے فٹ بال نیچے گری۔ یوسف چوری چھپے احمد ریشی کے ساتھ فُٹ بال کھیلنے نکل پڑا تھا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح آج سے سولہ سال پہلے میں نکلا کرتا۔ احمد ریشی آج بھی وہی احمد ریشی ہے جو آج سے سولہ سال پہلے تھا۔ سولہ سال پہلے وہ میرے ساتھ کھیلا کرتا اور آج وہ میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ جو مجھ سے بیس سال چھوٹا ہے۔
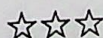
☆......صوفی غلام محمد
(کشمیری سے ترجمہ :رؤف راتھر)

جوانی یا مفلسی

جوں ہی شیلا موٹر سے اُتر کر بنگلے کی دہلیز کی سیڑھیوں پر ناز و انداز سے چڑھی اُس نے مہدہ کو جلدی میں سیڑھیاں اُترتے دیکھا۔ مہدہ نے سلام بجالانا چاہا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ شیلا نے بھی مہدہ کو سلام کرنے کی نوبت نہ آنے دی اور دور سے ہی کہہ اٹھی۔

''مہدہ بابا! کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔ آپ ٹھیک ہیں۔ مہدہ نے تعجیل سے جواب دیا اور مزید کچھ کہے بغیر سیدھے ہی موٹر کی طرف قدم بڑھائے اور سامان اُتارنا شروع کیا۔ موٹر میں کوئی اجنبی شخص بیٹھا تھا جو ابھی موٹر کی اسٹیرئینگ ہاتھ میں لئے کھڑکی کے شیشے سے ہی بنگلے اور باغ کو تک رہا تھا۔ مہدہ نے اُسے بھی سلام کیا۔

شیلا پھر سے بنگلے کی دہلیز سے نیچے اُتری اور شوہر سے کہا ''یہ ہمارا باغ ہے''۔ اِس کے بعد وہ مہدہ کی طرف مخاطب ہوئی۔ ''مہدہ بابا! اس باغ کا مالک اَب یہ ہے۔ یہ میرا شوہر ہے۔'' حالانکہ یہ اور بات ہے کہ مہدا شیلا کے بتائے بغیر بھی پہلے ہی جان گیا تھا۔ شیلا کا شوہر سریش دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ چہرہ گندمی اور سر پر فرنگی ٹوپی اور ٹائی پہنے ہوئے تھا۔ مہدہ، سُریش کو یوں تک رہا تھا جیسے وہ پرکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص واقعی شیلا کا خاوند کہلانے لائق ہے کہ نہیں۔ مہدہ کو جیسے وہ ایک آنکھ نہ بھایا اِسی لئے اُسے گھور گھور کے دیکھ رہا

تھا۔ جیسے شیلا سے کہہ رہا تھا:

''یہ کس کوّے کو لے آئی۔ یہ تمہارے لائق نہیں۔ یہ جوڑی نہیں جچے گی۔''

سریش موٹر سے اُترا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے مہدہ سے مخاطب ہوا۔

''بابا! اب میں تمہیں دکھاؤں گا کہ یہ باغ کیسے سجانا اور سنبھالنا ہے۔''

''بابا''!!! اِس لفظ نے مہدہ کے دِل و ذہن پر جیسے کاری ضرب لگائی۔ وہ اَب غور سے سریش کی طرف دیکھنے لگا۔ سریش جوانی کی سرحد پھلانگ کر اَب اَدھیڑ عمر کو پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ شیلا بھی کون سی کچی عمر کی تھی۔ وہ بھی تو چالیس کے قریب ہوگی۔

''مہدہ بابا''! شیلا نے شوہر سے بات کرتے ہوئے اُسے آواز دی۔

''مہدہ بابا''!!! مہدہ غصے کے گھونٹ اندر ہی اندر پیتا ہوا اُن کے قریب پہنچا۔

''دیکھ مہدہ بابا'' یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اِس باغ کو ٹھیک کریں گے۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ جو باغ کے بیچ میں سے سڑک گزر رہی ہے۔ اِسے ایک طرف کو لائیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا''۔ مہدہ نے اپنے نئے مالک کی بات کی تائید کی۔ کرتا بھی کیوں نہیں اب تو اُسے، اُنہی کی جی حضوری کرنی تھی۔ مہدہ واپس آکر پھر سے سامان کندھے پر لاد کر بنگلے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ شیلا اور سریش بنگلے کے اندر گئے۔ شیلا اپنے شوہر کو بنگلے کی ایک ایک چیز دکھانے لگی۔

''مہدہ بابا''۔ شیلا بنگلے کی کھڑکی میں سے جھانک کر مہدہ کو آواز دینے لگی۔

''مہدہ بابا''! مہدہ کی جبین پر بَل پڑ گئے۔ وہ اُن دونوں کے نزدیک پہنچا۔

''مہدہ بابا''۔ ''ہمیں یہ بنگلہ ٹھیک کرنا ہے۔ اس کی دیواروں کی لپائی جگہ جگہ اُتر گئی ہے۔ روغن بھی بے رونق ہوگیا ہے۔ تُم ایک کام کرنا، کسی کاریگر کو لے آنا''۔

مہدہ سوچ رہا تھا آج کیوں بنگلے کی اتنی خیر خبر لی جارہی ہے۔ اِس سے پہلے تو کسی نے بنگلہ سجانے کی زحمت نہ کی۔ شیلا کی تو بات ہی نہیں، شمبھوناتھ نے بھی جو بنگلے کا مالک

ہے۔ شمبھوناتھ ہر سال گرمیوں کے ایک دو مہینے اس بنگلے میں کاٹ کر باہر چلا جاتا۔ شمبھوناتھ نسلاً کشمیری تھا مگر وہ سال بھر کشمیر سے باہر رہ کر جانے کون سا بڑا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ اب تو کئی سال سے وہ یہاں آتا ہی نہیں۔

ہوسکتا ہے یہ بنگلہ شیلا کے شوہر کو بخشش میں ملا ہو۔ اسی لئے شیلا نے بھی بنگلے کا مالک اِسی کو جتایا تھا۔ مہدہ نے سوچا۔ ''ہاں یہی بات ہوگی۔ نہیں نہیں، ہوگی نہیں بلکہ ہے۔'' مہدہ نے آج سے کئی سال پہلے شمبھوناتھ کی زبانی سُنا تھا کہ وہ یہ بنگلہ اپنی بیٹی کو دیں گے۔

بنگلے کے سامنے ایک بڑا باغ تھا، جس میں سیب اور گلاس کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ سال بھر کے لئے چار پانچ سو روپیہ میں اِس کو ٹھیکہ پر دیا جاتا۔ مہدہ باغ سے حاصل آمدنی سے ہی اپنی تنخواہ نکالتا۔ بنگلے کے مالک کو بھی مہدہ کی تنخواہ کا بوجھ نہ اٹھانا پڑتا۔ وہ خود باغ کی بولی لگاتا، اِس چیز کے لئے اُس پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

مہدہ کو ''مہدہ بابا'' کہہ کر بُلانے سے شیلا اور سُریش اپنی طرف سے اُس کے تئیں محبت جتاتے مگر لفظ ''بابا'' مہدہ کو اندر ہی اندر کریدتا۔ اُسے یوں لگتا کہ جیسے اُس کے سارے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ وہ سوچ میں پڑتا، کیا میں 'بابا' بن گیا اور شیلا ابھی بچی ہی ہے۔ رہا یہ (سُریش) کچھوے کی عمر کا، یہ بھی مجھے ''بابا'' ہی بلاتا ہے۔

میں بابا کب سے بن گیا۔ شیلا اور میں تو ایک ہی عمر کے ہیں، جس دِن مجھے یہاں لایا گیا، یہ بھی تو میری طرح ''بچہ'' ہی تھی۔ اِسی کے باپ نے میرے والد مرحوم کو کہا تھا کہ کوئی لڑکا لے آو جو شیلا کے ساتھ مدرسے تک کتابیں لے کر جائے۔ اِسی کے لئے تو مجھے میرا بچپن کھو گیا۔ ابھی تو میں نے دنیا بھی نہ دیکھی تھی کہ مجھے کام پر لگا دیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن نہ تو مجھے یہ پتہ کہ بچپن کب گزرا نہ یہ کہ جوانی کہاں گئی۔ آج میں مہدہ بابا ہوں۔'' مہدہ خود کو تسلی دے رہا تھا کہ تم ابھی بوڑھے نہیں ہو اُرے تم تو شیلا کی ہی عمر کے ہو۔ لفظ ''بابا'' کہہ کر بُلانا اُس کے انگ انگ میں شعلہ دہکاتا۔ وہ سوچتا کوئی اور کہتا تو اور بات تھی لیکن شیلا کو کیا ہوا۔ وہ تو مجھ سے مانوس ہے۔ وہ کیوں مجھے ''بابا'' کہہ کر بُلاتی ہے۔ بال سفید ہونے

سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو میرے ساتھ ہی کھیلتی کودتی تھی۔ ہم تو ایک ہی عمر کے ہیں۔ پھر یہ کیسا فرق؟ مہدہ یہ سب تو کہتا مگر جب وہ خود کا اور پھر شیلا کے سراپا کا جائزہ لیتا تو بات سمجھ میں آتی۔ ''میں تو خواہ مخواہ شیلا کو خطاوار گردانتا ہوں۔ میں تو ہوں ہی ''بابا'' کہلانے لائق۔''

یہ سچ تھا شیلا گرچہ مہدہ کی ہم سن تھی، لیکن اگر کوئی اُسے مہدا کو ''بابا'' کہہ کر بُلاتے دیکھتا تو شیلا کو ہی قصوروار مانتا کیونکہ اُسے مہدہ کو ''بابا'' کہہ کر نہیں بلکہ ''دادا'' کہہ کر بلانا چاہیئے تھا۔ وقت نے بھی اِن دونوں کے ساتھ کچھ عجیب کھیل کھیلا تھا۔ زمانے کی ہواؤں نے ایک کو اُس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ جہاں اِنسان کا وجود خزاں کے پتے کی طرح جھڑ جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے کو اُس جگہ بٹھایا تھا جہاں سوکھے ہوئے پیڑوں پر بھی بہار کا رنگ چھا جاتا ہے۔ جہاں بوڑھوں کو جوانی اور جوانوں کو بچپن اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ شیلا تو ایسی لگ رہی تھی، جیسے اُس نے نوعمری سے نکل کر اَب دوشیزگی میں قدم رکھا ہے۔ جوانی کی مستی اُس کے انگ انگ سے اُبھر کر آرہی تھی۔ اُس کا شباب وقت کے ساتھ ساتھ ڈھل نہیں رہا تھا بلکہ اور نکھرتا اور سنورتا جارہا تھا۔ وہ کسی دوشیزہ کی طرح کبھی مٹک مٹک کر چلتی، کبھی کھِل کھلا کر ہنستی، کبھی گاتی، کبھی آہیں بھرتی، کبھی شرما جاتی۔ جیسے کوئی بن بیاہی جوان لڑکی۔ چار مہینے ہی ہوئے تھے اُسے بیاہے ہوئے۔ اگر وہ ابھی چار پانچ سال تک شادی نا بھی کرتی تو بھی دوشیزہ ہی نظر آتی۔ آج بھی جب وہ ٹینس کھیلتی تو ہرنی کی طرح دوڑتی نظر آتی۔

یہ تو تھا شیلا کا حال، اب مہدہ کا بھی حال دیکھیئے۔ اگر کوئی غور سے دیکھتا تو کہتا کہ یہ بیچارہ جانے کس گھڑی کا انتظار کر رہا ہے۔ ستھر اَسی سال کا تو ہوگا ہی۔ کمر بالکل جھکی ہوئی تھی۔ ذرا سا تیز چلنے سے اُس کی سانس پھول جاتی۔ تھوڑا سا وزن بھی اَب اُس کے لئے بارِ گراں بنتا۔

مہدہ کو اِس بنگلے میں باغوانی کرتے اب قریب تیس، بتیس سال ہو گئے تھے۔ وہ اِس بنگلے کا باغبان بھی تھا اور چوکی دار بھی۔ اُس کا دن اسی طرح گزرتا اور رات بھی ایسے ہی کٹتی۔ اکثر مہینے یا پندرہ واڑے کے بعد ہی اپنے گھر کا حال چال جاننے کے لئے جاتا۔

اس بنگلے میں آ کر اُس کا بچپن کب گزر گیا اور جوانی کب نکل گئی، اُسے خود پتہ نہیں۔ اُسے تو اپنے باپ نے یہاں یہ کہہ کر لایا تھا کہ ''چل مہدہ، میں تو اکیلا ہی گھر کی یہ چکی پیس رہا ہوں۔ تُم بھی ذرّا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ چکی پیستے پیستے اُس کے باپ کی ساری عمر چلی گئی۔ اَب صرف مہدہ یہ چکی پیسنے کے لئے رہ گیا تھا۔ گھر میں دو جوان بیٹیاں تھیں جنہیں دیکھ کر لوگ طعنے دیتے، ''مہدہ کو دیکھو کیسا بے غیرت ہے۔ بیٹیوں کو بوڑھا ہونے کے لئے رکھتا ہے گھر میں''۔ لوگ سچ ہی کہتے تھے۔ لوگوں کے طعنوں اور گھر کی لاچاری نے اُن کے سینے چھلنی کئے تھے اور وہ دوشیزگی میں ہی ادھیڑ عمر کی لگ رہی تھیں۔

مہدہ سوچتا رہتا، ''یہ لوگ کس طرح بوڑھے ہو کر بھی جوان ہوتے ہیں''۔ وہ سوچتا اور کافی سوچنے کے بعد اِس نتیجے پر پہنچتا کہ اصل میں یہ صاف دِل لوگ ہیں، جن کے دِلوں میں کوئی کھوٹ نہیں۔ اُس کے باپ نے بھی اُسے یہی کہا تھا۔

مہدہ جس بنگلے میں چوکی داری کرتا، وہ بنگلہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اُسی طرح نکھر رہا تھا جس طرح شیلا کی جوانی۔ دونوں دِن بہ دن جیسے نئی زندگی پا رہے تھے۔

اب کی بار شیلا نے بنگلے کو کچھ اِس طرح سجایا سنوارا تھا کہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ پُرانے بنگلے کی مرمت کی گئی ہے۔ بنگلہ ٹھیک ہوتے ہی شیلا نے مہدہ سے کہا، ''اَب کچھ دِن کے لئے ڈیڈی آئیں گے، ہم سے ملنے۔''

مہدہ خوش ہوا یہ سوچ کر کہ کتنے عرصے بعد بڑے صاحب آئیں گے۔

جب شیلا کے والد شمبھو ناتھ موٹر سے اُتر کر بنگلے کے قریب پہنچ گئے، مہدہ نے دوڑ کر سلام بجالانا چاہی، لیکن موٹر کے نزدیک پہنچ کر ہی وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ نہ جانے یہ کون تھا؟ شکل وشمائل سے تو شمبھو ناتھ ہی لگ رہا تھا مگر اُن سے قدرے صحت منداور توانا نظر آ رہا تھا۔

مہدہ نے سلام کیا، مگر اِس طریقے سے جیسے کسی اجنبی کو کیا جاتا ہے۔ وہاں سے بھی کِسی اجنبی کی طرح ہی سلام کا جواب دیا گیا۔ اِسی وقت شیلا آ پہنچی وہ اُردو میں اُس سے مخاطب ہوئی، ''دیر کیوں ہوئی ڈیڈی؟ اس شخص نے مہدہ کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا۔ ''یہ

کون ہے؟''۔ ''کیا یہ مہدہ بابا نہیں''شیلا کی طرف سے اثبات میں جواب پا کر شمبھو ناتھ مبہوت سا ہوا۔

''کیا یہ مہدہ بابا ہے۔میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔''

''مہدہ بابا! کہو کیسے ہو۔ٹھیک تو ہونا؟''

مہدہ نے گرچہ اثبات میں جواب دیا مگر یہی کہتے ہوئے اُس جیسے اُس کا گلا رندھ گیا۔وہ اندر ہی اندر سوچنے لگا،''میرے والد کی عمر کا شخص آج مجھے بابا کہہ رہا ہے۔''

☆☆☆

☆☆☆